قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

(21:107)

وہ ضابطۂ قوانین جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وراثتِ ارض حاصل ہوتی ہے اب' اے رسول ﷺ! دنیا کو تمہاری وساطت سے دیا جا رہا ہے۔ تم اقوامِ عالم سے کہہ دو کہ ان کی صحیح نشوونما' جس سے انسانی صلاحیتیں بیدار ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں، اسی ضابطہ کی اطاعت سے ہوسکتی ہے۔ جو قوم اس حقیقت سے انکار کرے گی' اس مرحمت ایزدی سے محروم رہ جائے گی (9:61)۔ یوں' تمہاری بعثت تمام اقوامِ عالم کے لئے حقیقی رحمت کا موجب بن جائے گی۔

(مفہوم القرآن از پرویزؒ)

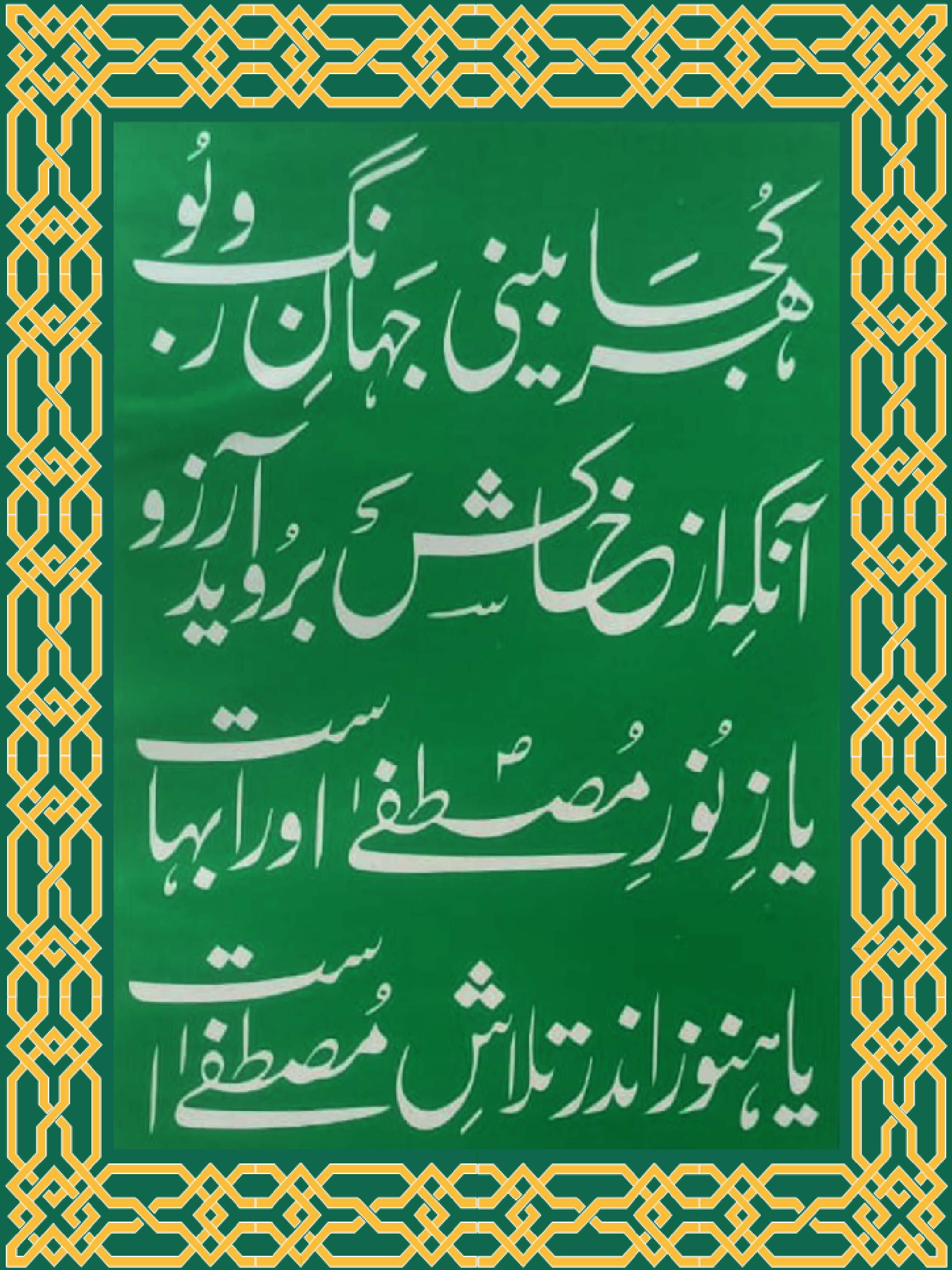
ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفیٰ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اکتوبر 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 10

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
اُسوۂ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	12
یہ تھا نظامِ مصطفےٰ ﷺ!	پرویزؒ	24
اسلام کے ہر رکن پر عمل کرنے سے دنیا میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہوتا ہے	خواجہ ازہر عباس، کراچی	45
دو قومی نظریۂ پاکستان والی اسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	48

ENGLISH SECTION

The world is desperate for Prophet's (PBUH) revolutionary system By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور   اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوع اسلام کے ایک بہی خواہ (Well Wisher) لکھتے ہیں:

طلوع اسلام کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حال کی خرابیوں پر تنقید تو ہوتی ہے لیکن کوئی متبادل اسکیم سامنے نہیں رکھی جاتی۔ طلوع سلام ہمارا محبوب ترین مجلہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کی مقبولیت میں فرق آئے۔ لہٰذا آپ اس طرف ضرور توجہ دیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ طلوع اسلام کو ایک جماعت بنانی چاہئے جو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لے اور جس مقصد کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا چلا آرہا ہے اسے عملی طور پر قوم کے سامنے پیش کرے۔ اس باب میں ہم اشارۃً اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ اپنا مقصد واضح کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں اس کی مزید وضاحت کردی جائے۔

چونکہ اس خط میں طلوع اسلام کے مسلک یا لائحہ عمل کے متعلق ایک اصولی چیز کو سامنے لایا گیا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب نجی طور پر دینے کے بجائے' اسے طلوع اسلام کے صفحات ہی پر پیش کیا جائے تا کہ قارئین طلوع اسلام اس باب میں ہمارے موقف سے مطلع ہوجائیں۔

طلوع اسلام کے متعلق اکثر احباب کی طرف سے یہ شکایت یا مشورہ موصول ہوتا ہے کہ طلوع اسلام کوئی عملی کام نہیں کر رہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ طلوع اسلام کو ایک جماعت بنانی چاہئے جو ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں عملاً حصہ لے اور جس مقصد کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا چلا آرہا ہے اسے عملی طور پر قوم کے سامنے پیش کرے۔ اس باب میں ہم اشارۃً اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ اپنا مقصد واضح کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں اس کی مزید وضاحت کردی جائے۔

ہماری ناکامیوں اور تباہ حالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بڑے جذباتی ہو چکے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور کوئی ایسا کام جس میں جذباتی تلاطم خیزیاں اور شورانگیزیاں نہ ہوں ہماری فطرت سیماب آسا کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ ہم ایک مدت کی جذبات پرستی سے اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایک ہنگامہ ہو' ایک جوش ہو' ایک خروش

ہؤ لچھے دار تقریریں ہوں، فلک بوس نعرے ہوں، سیل انگیز جلوس ہوں، بڑی بڑی انقلاب در آغوش اسکیمیں بنائی جائیں آسمان الٹ دینے والے منشور شائع کئے جائیں، تہلکہ مچادینے والے عزائم ومقاصد کا اعلان کیا جائے، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو فریق مخالف کو گالیاں دے کر جیل خانہ ہو آئیں۔ بس اس کے بعد آپ کے باعمل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ یہی معراجِ مقاصد ہے۔ یہی منتہائے جہاد ہے اور یہ سب کچھ ایک پارٹی بنا کر کیا جائے۔ جماعت سازی اور گروہ بندی کے بغیر آپ باعمل ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی حرارت کا مقیاس ہی پارٹی بازی ہے۔

یہ ہے ''عمل'' کا وہ تصور جو ایک عرصہ سے قوم کے ذہن میں نقش کیا جارہا ہے اور جس کے ذریعے قوم کے جذبات سے بری طرح کھیلا جارہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ کی گذشتہ تاریخِ سیاست میں کیسے کیسے دلفریب نعرے (Slogans) تھے جن سے قوم کے جذبات کو مشتعل کر کے اسے آگ کے شعلوں میں جھونک اور خون کی ندیوں میں دھکیل دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس دوران میں آپ کی قوم نے کس قدر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ تمام قربانیاں کس بری طرح سے رائیگاں گئیں۔ کتنے افراد ہیں جوان بے نتیجہ قربانیوں کے ہاتھوں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جوان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بے معنی ہنگاموں سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ کتنے بچے ہیں جن کی نگہ پرداخت کرنے والے ان تلاطم انگیز بے مقصد تحریکوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے اور ان کا آج کوئی والی اور وارث نہیں۔ کتنے گھر ہیں جن کے چراغ انہی جھکڑوں نے بجھا دیئے اور کتنے در ہیں جنہیں یہی آندھیاں اکھیڑ کر لے گئیں اور ان تمام بربادیوں اور تباہیوں کا ماحصل؟ فضا میں چند الفاظ سے پیدا کردہ وقتی ارتعاش اور سینوں میں چند نعروں سے ابھارا ہوا عارضی تموج۔ سوچئے کہ آپ کی بے شمار تحریکوں اور لاتعداد جماعتوں کے ''جہادِ زندگی'' کا مابقا اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ یہ تو یوں کہئے کہ قدرت کو ان چند کروڑ مسلمانوں کو بچانا مقصود تھا جو بساطِ سیاست کی آخری مہرہ بازی جناحؒ جیسے ٹھنڈے دماغ کے ہاتھ لگ گئی جس نے اس مردِ آخر بیں کے فکرِ صحیحہ کو یوں متشکل کر دکھایا جس کی مغفرت کے لئے عالمگیر کی مسجد جامع کے مینار شب و روز دست بدعا ہیں۔ ورنہ ہماری ہنگامہ خیز محفلوں کی یادگار آج سوائے خاکسترِ پروانہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتی۔

> خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقعہ نہ ہو جائے، کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوسکتا جب تک اس میں تطہیر فکر ونظر نہ ہو جائے، انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔

طلوع اسلام کو فطرت کی کرم گستری نے یہ سمجھنے کی توفیق ارزانی فرما دی کہ قوموں کے حالات ہنگامہ خیزیوں اور تموج انگیزیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی مستقل طور پر پیدا نہیں ہوسکتی جب تک ان کے قلب ونگاہ میں تبدیلی نہ پیدا ہو، خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقعہ نہ ہو جائے،

کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوسکتا جب تک اس میں تطہیرِ فکر ونظر نہ ہوجائے' انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے بے نقاب ہوگئی کہ فکر ونظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی راہ بڑی صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں بڑی آہستہ خرامی اور نرم روی کی ضرورت ہے۔ اس میں سطح کی تلاطم انگیزیاں نہیں بلکہ عمیق دریا کی غیر محسوس روانیاں ہیں۔ پھر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ جذبات پرست قوم پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپکنے کی خوگر ہوتی ہے اور قلب ونظر کی تبدیلی کے آثار کئی نسلوں کے بعد جا کر سامنے آیا کرتے ہیں۔ یعنی' غالب کے الفاظ میں' عجلت پسند قوم کی تمنائے حصولِ مقاصد بے تاب' اور دل کی دنیا کا عشق آسا انقلاب' صبر طلب ہوتا ہے۔ اس لئے ہنگاموں کی عادی قوم فکر ونظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو ''عمل'' میں شمار ہی نہیں کرتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق' شورش انگیز' ہنگامہ پرور ''راہنمایانِ ملت'' یہ الزام عائد کیا کرتے تھے کہ ''اقبالؔ ایک بے عمل شاعر ہے''۔ ان کے نزدیک عمل سے مفہوم انہی جیسی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ یہی لوگ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے متعلق بھی یہی طعن دیا کرتے تھے کہ وہ عملی انسان نہیں۔ اور عمل سے ان کی مراد ہوتی تھی جیل خانہ کی یاترا کرنا۔

ہنگاموں کی عادی قوم فکر ونظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو ''عمل'' میں شمار ہی نہیں کرتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے متعلق' شورش انگیز' ہنگامہ پرور ''راہنمایانِ ملت'' یہ الزام عائد کیا کرتے تھے کہ ''اقبالؔ ایک بے عمل شاعر ہے''۔ ان کے نزدیک عمل سے مفہوم انہی جیسی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ یہی لوگ قائداعظم علیہ الرحمۃ کے متعلق بھی یہی طعن دیا کرتے تھے کہ وہ عملی انسان نہیں۔ اور عمل سے ان کی مراد ہوتی تھی جیل خانہ کی یاترا کرنا۔

لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ ''سراپا عمل'' فصلی طیور' اپنی اپنی بولیاں سنا کر اڑ گئے اور باقی رہنے والے نتائج' انہی ''بے عمل'' انسانوں کے فکر ومساعی سے پیدا ہوئے۔

طلوعِ اسلام نے اپنے لئے قلب ونگاہ کی تبدیلی کی اسی دشوار گذار راہ کو تجویز واختیار کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ راہ کتنی لمبی اور اس کا سفر کس قدر حوصلہ آزما ہے۔ پیش پا افتادہ مفاد کی ایمان شکن جاذبیتیں بھی اس کے سامنے ہیں اور قدم قدم پر اسے دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ وہ ان مفادات کے سہل الحصول طریقوں کو بھی جانتا ہے اور ان کے غصب ونہب کی راہوں سے بھی واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لئے وہی طریق تجویز کیا ہے جس میں نہ کوئی عاجلانہ لذت ہے نہ نگاہ فریب کشش۔ نہ فوراً مشتعل ہوجانے والے جذبات کی جھوٹی تسکین کا سامان ہے نہ راتوں رات انقلاب برپا کر دینے والی طفلانہ آرزوؤں کی فریب دہی کا کوئی نسخہ۔ اس کی راہ' ستاروں کی سی خاموش روانیوں کی کہکشاں ہے جو رات کی پرسکوت و مہیب تنہائیوں میں بے بانگِ رحیل و بے جرسِ کارواں' چپکے ہی چپکے طول وطویل منازل طے کرتی جاتی ہے' هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ

الْفَجْرِ (97:5) وہ اپنے قارئین کی اس بے تابیٔ تمنا سے بھی خوب واقف ہے جو ایک طرف اس پر یقین رکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کی دعوت، حق وصداقت کی دعوت ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ مسند ہائے اثر و اقتدار پر وہ گروہ اور جماعتیں متمکن ہوئی جاتی ہیں جن کے پاس جذبات انگیزی کے سوا اور کچھ نہیں تو اس سے ان کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے جو بعض اوقات ان خطوط کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے اقتباس سے لمعات پیش نظر کی ابتدا ہوئی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ طلوع اسلام کوئی متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو ان کی اس سے مراد کیا ہوتی ہے! طلوع اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غلط چیز کو ہٹانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کی جگہ کونسی صحیح چیز رکھنی چاہئے۔ لہٰذا طلوع اسلام جب کبھی لا الہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی الا اللہ بھی پکارتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

لا و الا ساز و برگِ اُمتاں
نفیٔ بے اثبات مرگِ اُمتاں

ترجمہ: ''لا'' اور اِلا '' امتوں کا ساز و سرمایہ ہیں۔ نفی کے بعد اثبات نہ ہو تو یہ قوموں کی موت کا باعث ہے۔

اس لئے وہ تخریب بلا تعمیر کا نقشہ کس طرح سامنے رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کے جو بھی خواہ یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ تنقید کے ساتھ متبادل اسکیم نہیں پیش کرتا تو متبادل اسکیم سے ان کی مراد ایسی اسکیم ہوتی ہے جو زمامِ اقتدار و اختیار کو غلط ہاتھوں سے فوراً چھین لے۔ اگر متبادل اسکیم سے ان کی یہی مراد ہے تو وہ معاف رکھیں! طلوع اسلام ایسی متبادل اسکیم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کو تو وہ پیش پا افتادہ مفاد کی چھین جھپٹ قرار دیتا ہے جس نے قوم کو اس درجہ سطحی جذبات کا پیکر اور ہماری تمام تحریکات کو بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ طلوع اسلام ایسی ''متبادل اسکیم'' دیتا ہے جس سے قوم کی نگاہوں میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے کہ وہ زمامِ اقتدار و اختیار کسی غلط ہاتھ میں جانے ہی نہ دے۔ طلوع اسلام سے ایسی محکم اسکیم کی تمنا رکھئے، ویسی عاجلانہ اسکیم کی نہیں۔

> طلوع اسلام نے آج تک کوئی تنقید ایسی نہیں کی کہ جس کی تصحیح کا پہلو بھی وہ سامنے نہ لے آیا ہو۔ اس نے کبھی کوئی منفیانہ گوشہ ایسا نہیں پیش کیا جس کا مثبت گوشہ بھی ساتھ ہی اجاگر نہ کر دیا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ خلاء فطرت کے خلاف ہے۔

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی ست
زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی؟

ترجمہ: ہم قلندر ہیں ہماری کرامت ''جہاں بینی'' ہے۔ ہم سے ''نگاہ'' طلب کر ہم سے ''کیمیاء گری'' کیا

تلاش کرتا ہے؟

اور یہی وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی حالانکہ اس کے لئے احباب کی ''بیتابیٔ تمنا'' بار بار اصرار کر رہی ہے لیکن وہ اس طریقِ جماعت سازی کے بھی خلاف ہے اور اسے محض عاجلانہ مفاد پرستی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہ جماعتیں کس طرح بنتی ہیں؟ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر ایک پارٹی کا اعلان کرتے ہیں اور اس کے اغراض ومقاصد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں سے فریب خوردہ افراد اس نئی آواز میں پناہ ڈھونڈتے اور پہلی جماعت سے اپنی فریب خوردگی کے انتقام کا سامان مضمر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی دعوت پر لبیک کہہ دیتے ہیں۔ یوں یہ جماعت وجود میں آ جاتی ہے۔ اس کے بعد جماعتی عصبیت سے ان افراد میں سیمنٹ کا کام لیا جاتا ہے' یعنی ان کے دل میں اپنی جماعت کے برسرِ حق ہونے اور دوسری جماعتوں کے باطل پر اکٹھا ہونے کا ایمان کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ جماعتی عصبیت جسے قرآن كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ کی عمیق نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ہر جماعت اس عقیدہ میں مگن ہوتی ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔ اس طرح باہمی نفرت سے قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہی وہ فرقہ پرستی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کھلے لفظوں میں شرک کہتا ہے: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ (30:31-32) مسلمانو! دیکھنا کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر سے) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں پارٹیاں (فرقے) بنا لیں اور پھر خود بھی ایک پارٹی بن گئے اور ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ ہر پارٹی مگن ہو کر بیٹھ گئی کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔) قرار دیتا ہے اور خدا کا عذاب کہہ کر پکارتا ہے۔ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ (6:65)۔ کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا تمہیں پارٹیوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم ایک دوسرے سے لڑائی کا مزہ چکھو۔) پہلے زمانہ میں یہی گروہ بندی مذہبی فرقوں کے نام سے متعارف ہوتی تھی۔ اس دورِ سیاست میں یہ فرقہ بندی سیاسی جماعتوں کے پیرہن میں پائے کوب ہوتی ہے۔ روح وہی پرانی ہے' فقط نقاب نئے ہیں۔

> ہر جماعت اس عقیدہ میں مگن ہوتی ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔ اس طرح باہمی نفرت سے قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہی وہ فرقہ پرستی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کھلے لفظوں میں شرک کہتا ہے

کہا جائے گا کہ خود خدا بھی مسلمانوں کو حزب اللہ (خدا کی جماعت) قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہر جماعت شرک کا مظہر اور عذابِ خداوندی کا پیکر نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ خدا ملتِ اسلامیہ کو غیر مسلموں کے مقابلہ میں حزب اللہ کہتا ہے اور دوسروں کو حزب الشیطان۔ یعنی حزب اللہ' پوری کی پوری ملت ہے نہ کہ ملت کے

اندر ایک گروہ۔

پھر یہ کہا جائے گا کہ آج جس حالت میں مسلمان ہے جب انہیں اس حالت سے نکال کر صحیح اسلامی حالت تک لے جایا جائے گا تو اس کے لئے بہر حال کسی نہ کسی جماعت کی ضرورت ہوگی۔ جماعتی رنگ کے بغیر آپ کام کیسے کریں گے؟ سو پہلے تو یہ دیکھ لیجئے کہ قرآن نے جب فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرک اور عذابِ خداوندی قرار دیا ہے تو اس میں ایسے حالات میں بھی کسی استثنیٰ کا ذکر نہیں۔ اس کے بعد پھر وہی چیز سامنے آئے گی کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کیسے کیا جائے؟ تو سوال یہ ہے کہ کیا جماعت سازی کے بغیر اصلاح کے کام کی کوئی شکل نہیں نکل سکتی؟ کیا طلوع اسلام نے اپنی ہندوستان کی چار سالہ زندگی اور پھر اس کے بعد پاکستان کی نشاۃ ثانیہ میں جماعت سازی کے بغیر کوئی کام نہیں کیا؟ ضرورت ہے صرف کام کرنے والوں کی۔ یہ رفقائے کار اپنے اندر، تقسیم عمل کے طریق پر، نظم وضبط پیدا کریں گے اور ایک طے کردہ پروگرام کے ماتحت کام کرنا شروع کر دیں گے۔ ان کی دعوت یہ نہیں ہوگی کہ ہماری ''جماعت'' میں شامل ہو جاؤ۔ یہ اپنے آپ کو کسی پارٹی کے ساتھ منسوب کئے بغیر، مسلمانوں کے فکر ونظر میں تبدیلی کی کوشش کریں گے۔ یہ انہیں مذہب کے غلط تصور کی بجائے، دین کا صحیح تصور دیں گے۔ ان کی حیثیت معلمین کی ہوگی نہ کہ کسی پارٹی کے داعیان کی۔ اس وقت بھی حلقہ طلوع اسلام میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طلوع اسلام کی پیش کردہ تعلیم کو اپنے اپنے دائرۂ عمل واثر میں نہایت خاموشی سے پھیلاتے رہتے ہیں اور، دوسرے تو ایک طرف، خود ادارۂ طلوع اسلام کو بھی ان کی اس تبلیغ وتشہیر کا علم نہیں ہوتا، وہ کسی جماعت کے رکن نہیں، کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دائرہ میں رجعت الی القرآن کی اس دعوت کو عام کرتے رہتے ہیں جس کا نقیب طلوع اسلام ہے۔ طلوع اسلام کو اپنے ان خاموش، گمنام اور غیر متعارف، مبلغین پر ناز ہے کہ اس کا مقصود اس قسم کے لوگ پیدا کرنا ہے جو ہنگامہ آرائیوں سے الگ ہٹ کر چپکے ہی چپکے دوسروں کے قلب ونگاہ میں وہی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان کی نگاہ میں پیدا ہو چکی ہے۔ انہی غیر متعارف مبلغین میں سے اکثر ادارۂ طلوع اسلام کے ساتھ اپنا ربط قائم رکھتے ہیں۔ وہ ادارہ سے ان مشکلات کا حل دریافت کرتے ہیں جو انہیں اپنی اس تبلیغ کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ وہ ان استفسارات کا جواب پوچھتے ہیں جو ان سے دوران تبلیغ میں کئے جاتے ہیں اور جن کے جواب میں انہیں دقت پیش آتی ہے۔ وہ اپنے مشوروں سے ادارہ کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح قرآن کے طالب علموں کا یہ ایک خاموش سا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حلقہ کا کوئی نام نہیں، یہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ ان کے سامنے کوئی پیش پا افتادہ مفاد نہیں۔ یہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ

قرآن کے طالب علموں کا یہ ایک خاموش سا حلقہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس حلقہ کا کوئی نام نہیں، یہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ ان کے سامنے کوئی پیش پا افتادہ مفاد نہیں۔ یہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔

وہ جس ذہنی اور قلبی انقلاب کے لئے کوشاں ہیں اس کے سوا ملت کے مرضِ کہن کا کچھ اور چارہ نہیں۔ اس وقت اس انقلاب کے کوئی محسوس اور نمایاں آثار ان کے سامنے نہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی پوری عمر اس جدوجہد میں صرف کر دیں اور یہ انقلاب محسوس صورت میں ان کے سامنے نتیجہ خیز نہ ہو۔ لیکن وہ اس کے باوجود نہایت استقلال و استقامت سے اپنی کوششوں میں منہمک ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی بنیادی تبدیلیاں ایک دن میں رونما نہیں ہوجایا کرتیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن کے متعلق اور تو اور خود ذات رسالتمآب ﷺ سے کہہ دیا گیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے محسوس نتائج حضور ﷺ کے بعد ظہور پذیر ہوں۔ اس لئے کہ اس جدوجہد میں کسی ایک فرد یا افراد کی اپنی زندگی کا سوال ہی نہیں۔ سوال تو پوری کی پوری قوم میں انقلاب پیدا کرنے کا ہے اور اس کے بعد، تمام نوعِ انسانی میں انقلاب پیدا کرنے کا۔ یہ ایک نسل کی جدوجہد میں پیدا ہو جائے یا اس کے لئے دس نسلوں کی مسلسل جدوجہد کی ضرورت پیش آئے۔ مدت کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ اگر اسی قسم کے انقلاب کی کوشش سو سال پہلے شروع ہوتی تو آج جو کچھ ہم دیکھنا چاہتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ اگر یہ کوشش اس سے پہلے شروع نہیں ہوئی تو اسے آج شروع کر دینا چاہئے تاکہ آج نہیں، تو کل، کسی نہ کسی وقت یہ انقلاب ظہور پذیر ہوجائے۔ لیکن اگر آپ مدت کی طوالت سے گھبرا کر، پھر عاجلانہ طریقِ کار کی طرف لپک پڑے تو یہ انقلاب پھر ویسے کا ویسا رہ جائے گا۔ یہ عاجلانہ طریق کار، سر درد کے لئے اسپرین کی ٹکیہ ہے۔ سر درد ایک منٹ میں غائب ہوجائے گا لیکن جب اسپرین کا اثر زائل ہوگا تو پھر پہلے سے بھی دگنی شدت کے ساتھ ابھرے گا اور اگر آپ اسے ہر بار اسی طرح اسپرین کے عاجلانہ علاج سے دباتے رہے تو ممکن ہے ایک دن آپ کو درد کی جگہ سر سے ہی جواب مل جائے۔ مسلمان جذبات پرستی کی اسپرین سے علاج کا خوگر ہو رہا ہے، یہ عاجلانہ فائدہ چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں سر درد غائب ہوجائے۔ لیکن ایک طبیب حاذق کی نگاہ عاجلانہ فائدہ پر نہیں بلکہ مزمن مرض کی علت کی اصلاح پر ہوتی ہے اور وہ اصلاح وقت بھی چاہتی ہے اور علاج میں استقامت بھی۔ اس میں ایک سر درد کے علاوہ اور دردِ سری بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن جب آرام آئے گا تو ہمیشہ کے لئے مرض جاتا رہے گا۔ طلوع اسلام اسپرین کی ٹکیہ نہیں دیتا۔ یہ اسی حاذقانہ انداز سے علاج کرنا چاہتا ہے جس طریق سے اس سے پہلے ایک مرتبہ علاج ہو چکا ہے اور اس علاج کے نتائج دنیا دیکھ چکی ہے۔

> یہ عاجلانہ طریق کار، سر درد کے لئے اسپرین کی ٹکیہ ہے۔ سر درد ایک منٹ میں غائب ہو جائے گا لیکن جب اسپرین کا اثر زائل ہوگا تو پھر پہلے سے بھی دگنی شدت کے ساتھ ابھرے گا اور اگر آپ اسے ہر بار اسی طرح اسپرین کے عاجلانہ علاج سے دباتے رہے تو ممکن ہے ایک دن آپ کو درد کی جگہ سر سے ہی جواب مل جائے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی ۔۔۔ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

یہ ہے طلوع اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور یہ ہے اس مقصد کے حصول کے لئے اس کا طریق کار۔ جو اس طریق کار کی افادیت اور خیریت انجام پر یقین رکھتا ہے وہ اس کا ساتھ دے۔ لیکن جو اسی جدوجہد کو کامیاب تصور کرے جس میں عاجلانہ مفاد کو سمیٹا جا سکے، اسے کوئی اور ساتھی تلاش کرنا چاہئے کہ اس کے لئے اس طریق کار میں محنت و مشقت کے سوا کچھ نہیں۔ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا وَمَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ (2:200) ''جو شخص محض پیش پا افتادہ قریبی مفاد چاہتا ہے (اسے وہ مفاد تو مل جاتے ہیں۔ نُؤۡتِہٖ مِنۡہَا (3:145) لیکن اس کا مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔'' اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ ان دونوں راہوں میں سے جونسی راہ پسند کریں اپنے لئے تجویز کر لیں۔ طلوع اسلام اپنے لئے ایک راہ تجویز کر چکا ہے اور اسے اس راہ کے صراط مستقیم ہونے پر یقین ہے۔

کہہ دیا جائے گا کہ آپ قلب و نگاہ کی تبدیلی کی فکر کرتے رہئے اور اتنے میں بے زمام قوتیں ایسا استحکام حاصل کر جائیں گی کہ پھر ان کے پاؤں اکھیڑنا ممکن نہیں رہے گا۔ لیکن یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ نہ ہم جناب صاحب ضرب کلیمؑ اور حضور نبی اکرم ﷺ سے بڑھ کر داعیٔ انقلاب ہیں اور نہ ہی یہ سرکش قوتیں، فرعون اور ابوجہل سے زیادہ محکم گیر ہیں۔ حضرت موسیٰؑ چالیس برس تک قوم کے قلب و نگاہ کی صحیح تربیت میں مصروف تگ و تاز رہے اور بنی اسرائیل ارض موعود پر ان کی وفات کے بعد قدم رکھ سکے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کامل تیرہ برس تک نہایت سکون و استقامت سے اپنے پیغام کی خاموش تبلیغ میں منہمک رہے اور اس دوران میں سرکش قویٰ کی طرف سے آپ صعوبات کو بڑی ہمت اور استقلال سے برداشت کرتے رہے۔ جب انہیں بھی بیج سے کھیتی پکنے تک کا عرصہ انتظار میں گذارنا پڑا تو ہم کس طرح دانہ بوتے ہی فصل کاٹ سکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات اس بیتابیٔ تمنا یا مفاد عاجلہ کے مظاہر ہیں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ جمہور کی نگاہ کی تبدیلی سے اتنا بڑا تند و تیز سیلاب اٹھا کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی زمین گیر قوتیں اس کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جایا کرتی ہیں۔ سرکش قوتوں کی یہ محکمیت اسی وقت تک عمیق و شدید دکھائی دیتی ہے جب تک ہم میں ناپختگی ہے۔ داعیانِ انقلاب کے قلب و نگاہ کی پختگی اور محکمی کے آگے یہ قوتیں پر کاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ نہایت استقامت اور سکون سے قلب و نگاہ کی تبدیلی کے لئے سعیٔ پیہم میں مصروف رہئے اور جب یہ تبدیلی پختگی تک پہنچ جائے تو باطل کی قوتوں کو ایک ہی جھٹکے سے الگ کر دیجئے۔

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن — بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

ترجمہ: (بڑی قوتوں سے ٹکرانے کے لئے) تو درویشی کا نشہ (شراب) برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر اور پھر اس نشہ کو مسلسل پینا شروع کر دے۔ جب یہ نشہ تجھ میں جرأت و ہمت پیدا کر دے تو پھر ایران کے بادشاہ جمشید کی سلطنت سے ٹکر لے (یہ فقیری نشہ کر کے تو وقت کے جابر حکمرانوں سے ٹکرانے کی ہمت حاصل کرے گا)۔

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

ایمان اور اعمال صالحہ سے ایک مسلمان کی زندگی تغیر آشنا ہوتی ہے تو اگلا قدم اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (49:10) کے عملی اظہار کے لئے تشکیل اُمت کا ہے۔ مسلمان جب نئی اخوت میں منظم کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں وقار و آبرو سے نوازتا ہے اور زمین میں استخلاف جیسی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ ۔۔۔(24:55)

> مسلمان جب نئی اخوت میں منظم کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں وقار و آبرو سے نوازتا ہے اور زمین میں استخلاف جیسی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔

مفہوم: ہم نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (33:27) (اور ان کی حکومت، اس خطۂ اَرض کو جنت میں تبدیل کر دے گی 39:74) —— یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی (28:6)—— اسی قانون کے مطابق ہم ان کے اِیمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور ان کے اُس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے۔ جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗ (مومنون) نے ایمان و اعمالِ صالحہ کی بنا پر ایک اُمت کے طور پر اپنا کردار ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس روئے زمین پر حکومت سے سرفراز فرمایا جن سے نئی ذمہ داریاں عائد ہوئیں:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ

الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41)

مفہوم: اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی' انہیں اِقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے (تاکہ تمام افرادِ معاشرہ' قوانین خداوندی کا اِتباع کرتے چلے جائیں)۔ یہ تمام نوعِ اِنسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھیں گے کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں' بحث وتمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد' آخرالامر) ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو گا (5:44)۔

> جو باتیں اس طرح سے قابلِ قبول ٹھہرائی جاتی ہیں، انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the society) اور جب باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے، انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول ونامعقول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں اور اس تقسیم وتفریق کا معیار ہوتا ہے قرآنِ کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔

آیہ مذکور (22:41) میں جو ذمہ داریاں اور فرائض جماعت مؤمنین پر عائد ہوتے ہیں۔ ان میں سے اقامت ِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا تذکرہ سابقہ تحریروں میں ہو چکا ہے۔ دوسری ذمہ داریاں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' ہیں اور آخر میں مقام ہے ''عاقبۃ الامور'' کا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انہیں آج کی محفل میں بیان کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' اکثر مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً: 3:104؛ 7:157؛ 9:112 وغیرہ) ان الفاظ (معروف اور منکر) کا صحیح مفہوم یوں سمجھئے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لئے قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین وقانون اور قواعد وضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اس طرح سے قابلِ قبول ٹھہرائی جاتی ہیں، انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the society) اور جب باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے، انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول ونامعقول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں اور اس تقسیم وتفریق کا معیار ہوتا ہے قرآنِ کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعۡرُوۡفٌ وہ ہیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں۔ اور مُنۡکَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی ''فطرت'' اِبا (یا نفرت) کرے۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کر سکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کے لئے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مَعۡرُوۡفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے اور مُنۡکَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرائے۔ ان میں قرآنی مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج سب آ جاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کر کے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دیئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعۡرُوۡفٌ وہ ہیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں۔ اور مُنۡکَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی ''فطرت'' اِبا (یا نفرت) کرے۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کر سکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کے لئے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔

مَعۡرُوۡفٌ وہ ہے جسے قرآنی معاشرہ (Recognize) کرے اور مُنۡکَرٌ وہ جسے وہ (Recognize) نہ کرے۔ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ مَعۡرُوۡفٌ میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائے گی (60:12) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہر اس بات میں اطاعت کی جائے گی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے اور قرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول و قوانین و احکام کے مطابق ہوں۔ جو بات قرآنِ کریم کے خلاف ہوئی وہ معروف نہیں بلکہ مُنۡکَرٌ ہو گی۔ یہی مَعۡرُوۡفٌ اور مُنۡکَرٌ کا اٹل معیار ہے۔

قرآنِ کریم کا فرمان ہے:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (3:104)

مفہوم: ''اِس نظام کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ تم ایسی جماعت بن کر رہو (3:109; 2:143) جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ تمام نوعِ انسان کو قرآن کی طرف دعوت دے (22:78)۔ اُن امور کو عملاً نافذ کرے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرے اور اُن سے روکے جو اِس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ [یہی فریضہ اس وقت یہ رسول ﷺ ادا کر رہا ہے اور ایسا ہی تمہیں بھی کرنا ہو گا (7:157; 9:71; 9:112)۔ اس کے لئے

تمکن فی الارض —— اپنی آزاد مملکت کا وجود —— ناگزیر ہے (22:41)]۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں اور جو نہایت کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں (23:1)۔

محولہ ذیل آیات بھی ایک نظر دیکھتے جایئے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ...... (7:157)

مفہوم: (اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصے میں آئے گی، جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے) اس رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن ملنے سے پہلے) اُمی تھا (29:48)۔ جس کی علامات (یہود و نصاریٰ) اپنے ہاں، تورات اور اِنجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحیٔ خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے، اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رُو سے ناپسندیدہ ہیں۔۔۔۔۔

رسول کریم کے اس اسوۂ حسنہ کے اتباع میں مومنین کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔۔۔ (9:71)

مفہوم: ''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب، نصب العین کے مشترک ہونے کی وجہ سے، ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطۂ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔۔۔''

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۭ (9:112)

مفہوم: ''ان افرادِ معاشرہ کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں کہ:

وہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔

وہ ان تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جو قوانین خداوندی نے متعین کی ہیں، اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اَمر بالمعروف:

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، قرآنِ کریم نے (بجز چند احکام معروف امور کی فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ البتہ معاشرتی روابط اور ازدواجی معاملات کے بعض شعبوں میں ''معروف'' کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً:

1۔قانونِ قصاص میں اگر قتل عمداً نہیں کیا گیا، یونہی سہواً ہو گیا ہے تو اس صورت میں (4:92) دِیت (معاوضہ) کی سزا دی جائے گی۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (2:178)

ترجمہ: اس دیت کی رقم سے، جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی، تو تابعداری کرنی چاہئے موافق قاعدہ وقانون (معروف) کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو خوبی کے ساتھ۔

2۔وفات پر ترکہ کی صورت میں:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (2:180)

جب تم دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے، اور تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو، تو تم اپنے والدین اور اَقربین کے لئے (یعنی جنہیں بھی تم اپنا قریبی سمجھو، خواہ وہ تمہارے رشتہ دار ہوں یا کوئی اور) قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضہ خداوندی ہے۔ (ترکہ کی تقسیم، وصیت پوری کرنے کے بعد ہو گی (4:11))۔

> مَعْرُوفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے اور مُنْكَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرائے۔ ان میں قرآنی مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد وضوابط اور رسوم ورواج سب آ جاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کر کے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دیئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

3۔عورتوں کے حقوق وفرائض کے بارے میں ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (2:228)

ترجمہ: اور عورتوں کے لئے ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ان پر فریضہ ہے قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق۔

4۔طلاق کے بارے میں ہے:

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (2:229)

مفہوم: ''ایک مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں دو مرتبہ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ طلاق کے بعد، عدت کے دوران یا اس کے بعد، قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق، ازدواجی رشتہ استوار کر لیں یا حسن کارانہ انداز سے الگ ہو جائیں۔۔۔''

5۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ
(2:231)

ترجمہ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی معیاد آ لگے تو اس وقت قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق انہیں روک لو یا قاعدے اور قانون کے مطابق انہیں چھوڑ دو۔

6۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (2:232)

ترجمہ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی معیاد پوری ہو جائے تو انہیں نہ روکو اس سے کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ آپس میں قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق رضامند ہو جائیں۔

7۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (2:233)

ترجمہ: اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس اس کے لئے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے، اس پر ان عورتوں کا کھانا اور پہننا رہے قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق۔ کسی جان پر بوجھ نہ رکھا جائے گا مگر اس کے مقدور بھر۔

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی معیاد پوری ہو جائے تو انہیں نہ روکو اس سے کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ آپس میں قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق رضامند ہو جائیں۔

8۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (2:233)

اور اگر تم چاہو کہ دائیوں سے اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو بھی تم پر مضائقہ نہیں جبکہ جو قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق دینا ٹھہرا تھا وہ انہیں ادا کر دو۔

9۔ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (2:234)

تو جب ان (بیوہ عورتوں) کی عدت پوری ہو جائے تو تم پر کوئی مواخذہ نہیں اس کام میں جو وہ عورتیں اپنے معاملہ میں قاعدے اور قانون (معروف) کے مطابق کریں۔

10۔ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى

يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ (2:235)

ترجمہ: اور (دوران عدت) عورتوں سے نکاح کا خفیہ وعدہ نہ کررکھو مگر یہ کہ اتنی بات کہو جو قاعدے اور قانون (رواج) کے مطابق (معروف) ہو اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو جب تک کہ لکھا ہوا حکم اپنی معیاد کو نہ پہنچ جائے۔

11۔لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ۖ وَّمَتِّعُوۡهُنَّ ۚ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَى الۡمُحۡسِنِيۡنَ (2:236)

ترجمہ: تم پر کچھ مطالبہ نہیں کہ تم عورتوں کو طلاق دو جبکہ تم نے ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو یا مہر مقرر کر لیا ہو۔ ان کو کچھ ساز و سامان دو۔ مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگ دست پر اس کے لائق جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق (معروف) ہے۔ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر۔

12۔وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَوۡلِ غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ فَاِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِىۡ مَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ ؕ (2:240)

ترجمہ: اور جو تم میں سے مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر کا نان و نفقہ دینے کی' بے نکالے۔ پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس کا مؤاخذہ نہیں جو انہوں نے اپنے معاملہ میں مناسب طور (قاعدے اور قانون کے مطابق) کیا۔

13۔وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ ۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ (2:241)

ترجمہ: اور طلاق والیوں کے لئے بھی مناسب طور پر (قاعدے اور قانون کے مطابق) نان و نفقہ ہے۔ یہ واجب ہے متقین پر۔

14۔قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى ؕ (2:263)

ترجمہ: صاحبِ احتیاج کو (دینے کے بعد احسان جتانے سے) بہتر ہے کہ اسے اچھے (معروف) انداز سے جواب دے دیا جائے اس خیرات سے جس کے بعد ستانا ہو۔

15۔ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَـكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى (65:6)

مطلقہ عورتوں (کو اگر بچہ پیدا ہو) تو اگر وہ تمہارے لئے بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں اس کی اُجرت دو اور آپس میں معروف (قاعدے اور قانون کے مطابق معقول) طور پر مشورہ کرو۔ پھر اگر باہم مضائقہ کرو تو قریب

ہے کہ اسے اور دودھ پلانے والی مل جائے گی۔

16۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے بارے میں حسنِ سلوک اور شکریہ کی تاکید فرمائی ہے۔ تاہم

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ۫ (31:15)

ترجمہ: اگر وہ دونوں تجھ سے کوشش کریں کہ تو میرا شریک ٹھہرائے ایسی چیز کو جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان اور ان سے دنیاوی معاملات میں معروف (نیک برتاؤ) کرتے رہو۔

مندرجہ بالا قرآنی احکام اور مثالوں سے اَمر بالمعروف کے وہ طریقے سمجھ میں آسکتے ہیں جن پر عمل کروا کر نبی کریم ﷺ نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ سیٹ کیا ہے۔

نہی عن المنکر:

قرآنِ کریم میں سورۃ النحل میں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (16:90)

مفہوم: ''جو کچھ ہم نے اس کتاب میں کہا ہے اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تم:

(1) ہر ایک سے عدل کرو ـــــ یعنی ہر ایک کا پورا پورا حق دو۔

(2) جس میں، کسی وجہ سے کوئی کمی رہ جائے، اس کمی کو پورا کرو، خواہ اس کے لئے اُس کے حق سے زیادہ دینا پڑے۔ اور اس طرح معاشرہ کے توازن کو قائم رکھو۔

(3) اس ''عدل و احسان'' کی ابتدا اپنے قریبیوں ـــــ اہل خاندان اور آس پاس کے لوگوں ـــــ سے کرو، اور پھر اس کا سلسلہ عالمگیر کرتے چلے جاؤ۔

(4) بخل سے ہمیشہ بچو۔ یعنی یہ نہ کرو کہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر بیٹھ جاؤ۔ اللہ نے تمہارے لئے جو حدود مقرر کر دی ہیں، ان سے کبھی تجاوز نہ کرو۔ کسی حالت میں بھی قانون شکنی نہ کرو۔

(5) عقل فریب کار کی حیلہ جوئیوں سے بچو جو تمہیں اِنفرادی مفاد پرستیوں کے لئے اُبھارتی رہتی ہے۔ اور

یہ اخلاقی اَقدار اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ تم اِنسانی زندگی کے بلند مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھو اور زندگی کو

محض طبیعی (حیوانی) زندگی نہ سمجھ لو۔''

اس آیتِ مذکورہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (اللہ تعالیٰ فحشاء اور منکر سے روکتا ہے)۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے مُنۡکَر کے معنی ہیں عقلِ خود بیں کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ یہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے۔ دوسرے اپنی فکر آپ کریں اور فَحۡشَآءِ کے معنی بخل کے بھی ہیں اور عام بے حیائی کے بھی۔ نوعِ انسان کی عمومی نشوونما کے لئے دینے کے بجائے عقلِ خود بین کی فریب کاریاں ہی ہیں جو مختلف طریقوں سے دولت کے ارتکاز کو اپنے اور اپنوں کے حلقہ میں ہی محصور کر لیتی ہیں اور قانونی چارہ جوئیوں اور حیلوں سے بخل کا طریقِ کار اختیار کرتی ہیں۔ آج کل معاشی اور معاشرتی مافیاز (Mafias) یہی کام کرتی ہیں اور ''مُنۡکَر'' انہیں جواز فراہم کرتی ہے۔

یہ شیطانی نقوش قدم ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ وَمَنۡ یَّتَّبِعۡ خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ فَاِنَّہٗ یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ (24:21)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے عمل کو آج کل (Maintenance of law & order) کہتے ہیں اور یہ حکومتی اداروں کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جس مملکت میں لاء اینڈ آرڈر کا استقرار، حفاظت اور خبر گیری نہ ہو وہ مملکت اپنا جواز کھو دیتی ہے۔

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقوش قدم پر نہ چلو اور جو کوئی شیطان کے نقوشِ قدم پر چلے گا تو وہ تو بخل اور ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے، بے حیائی اور حد سے تجاوز کرنے (فحشاء) اور عقلِ خود بین کی فریب کاری اور ناپسندیدہ بات کا حکم دیتا ہے۔

دوسرے مقام پر فحشاء کے حوالہ سے سورۃ البقرہ میں ہے:

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ (2:268)

مفہوم: ''شیطان (تمہارے انفرادی مفاد) کے خیالات تمہیں یہ کہہ کر ڈرائیں گے کہ اگر تم نے سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا تو تم مفلس اور نادار ہو جاؤ گے۔ کل کو تم پر برا وقت آیا تو کیا کرو گے؟ اس لئے تم اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وہ تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے (فحشآء)۔

انفرادی مفادات کے شیطانی خیالات اور عقلِ خود بین کی فریب کاریوں سے بچنے کے لئے قرآنِ کریم کی اتباع اور نظامِ صلوٰۃ کے قیام کا طریقِ کار بتایا گیا ہے۔ جس کی رو سے معاشرہ میں تنہا رہ جانے والوں (یتیموں) کی سرپرستی ضروری قرار دی گئی ہے اور جن کے چلتے کاروبار رک گئے ہوں اور جن کی زندگی کی نبضیں رک رہی ہوں، انہیں طعام و رزق کی فراہمی

لازمی قرار دی گئی ہے۔ صلوٰۃ کی ظاہری شکل وصورت کے بجائے اس کی اصل حقیقت کو مدِنظر رکھ کر لوگوں کو ان کے استعمال کی چیزوں کی فراہمی کو صلوٰۃ کا نمایاں شعار قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ (29:45)

''(اے رسولؐ!) تم ان قوانین کو جو تمہیں بذریعہ وحی دیئے گئے ہیں، لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہو اور خود، ان کے مطابق نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ یقیناً یہ نظام لوگوں کو ان کی اس روش سے روک دے گا جس کی رُو سے، ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا اور اس مقصد کے حصول کے لئے، عقلِ خود بیں کی فریب کاریاں انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں (70:21-27)۔ فحشآء اور مُنکَر سے روکنے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ انسان کو شرفِ عظیم عطا کرتا ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ نظام اس صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ انسانی معاشرہ میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قانون کو حاصل ہو۔ اس کے مقابلہ میں تمہارے خود ساختہ نظام اور قوانین، کیا کرتے ہیں، خدا کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ احکامِ خداوندی کی میکانکی طور پر تعمیل (Ritualism) سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔''

اگر معاشرہ سے مُنکرات کو روکنے کا اہتمام نہ کیا جائے اور عقلِ خود بین کی فریب کاریاں پروان چڑھتی رہیں۔ مافیاز اپنی کرتوتیں سرانجام دیتے رہیں اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو تو معاشرہ میں برائیوں کے نفوذ کی وجہ سے، اللہ کی رحمت مونہہ موڑ لیتی ہے اور خدا کی نوازشات چھن جاتی ہیں:

کَانُوۡا لَا یَتَنَاہَوۡنَ عَنۡ مُّنۡکَرٍ فَعَلُوۡہُ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ (5:79)

ترجمہ: ''انہوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال (مُنکر) کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ بُرا عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے عمل کو آج کل (Maintenance of law & order) کہتے ہیں اور یہ حکومتی اداروں کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جس مملکت میں لاء اینڈ آرڈر کا استقرار، حفاظت اور خبر گیری نہ ہو وہ مملکت اپنا جواز کھو دیتی ہے۔

وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ:

قرآنِ کریم کی سورہ الحج کی آیت (22:41) کے حوالہ سے اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ کا تذکرہ سابقہ تحریروں میں

اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ اس آیت کے حوالہ سے آخری بات وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ کی وضاحت اور اسوۂ حسنہ نبی کریم ﷺ کا تعلق اب پیش کیا جاتا ہے۔

اور سب معاملات کا فیصلہ اللہ (کے قانون) کے مطابق ہوتا ہے۔

ترکیب عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ میں لفظ عاقبۃ کا معنی ہے ہر چیز کا آخر۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اَلْعُقْبُ وَالْعُقْبٰی اچھے بُرے کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ نیز عَاقِبَةٌ بھی۔ جبکہ عِقَابٌ اور عَقُوْبَةٌ سزا کے لئے۔ ان معانی کے اعتبار سے، اس حصۂ آیت کا معنی ہوگا کہ زمین میں اسلامی اقتدار کے قیام کے نتیجہ میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اچھے نتائج اور بدلہ کا انحصار اس بات پر ہے کہ جملہ امور میں قانونِ خداوندی کی مطابقت اختیار کی جائے۔ انجام بہرحال اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگا۔ اس سے یہ تاکید مقصود ہے کہ ان امور میں قوانینِ خداوندی کی مطابقت کو لازم پکڑا جائے، ان کی مخالفت نہ کی جائے۔

> قرآنِ کریم میں خداوندی قوانین کی تکمیل (6:116) کے بعد ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا (33:40) اور ان نقوشِ قدم کو جو رسول اللہ ﷺ نے چھوڑے، قیامت تک کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دے دیا گیا (33:21)

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (31:22)

مفہوم: ''(صحیح راستے پر وہ ہے) جو اپنے تمام رجحانات اور تقاضوں کو قانونِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے اور اس طرح حسن کارانہ انداز سے نہایت متوازن زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ وہ ہے جس نے اپنی زندگی میں ایک ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو اسے کبھی دغا نہیں دے گا (2:265)۔ اس لئے کہ کائنات میں ہر کام، قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے (اور اس نے انہی قوانین کو اپنا راہنما بنایا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کا کوئی کام بگڑ جائے۔''

مندرجہ بالا مقاصد کے لئے قرآنِ کریم میں وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (2:210، 3:109، 8:44، 22:76، 35:4، 57:5) بھی آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''سب کام اللہ ہی کی طرف پھرتے ہیں''۔ اسی طرح ایک مقام پر اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (42:53) جس کا ترجمہ بھی یہ ہے کہ '' آگاہ رہو سب کام اللہ ہی کی طرف پھرتے ہیں۔''، یعنی تمام امور اسی کے قانون کے مطابق انجام پاتے ہیں۔

اس تاکیدی حکم سے مراد ہے کہ استخلاف فی الارض کے حصول کے بعد اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف

ونہی من المنکر میں جہاں کہیں ضروری قانون سازی یا تعمیل احکام کی تفاصیل طے کرنی ہوں، وہاں حالات کے صحیح جائزہ اور باہمی مشاورت کے بعد آخرالامر ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کی حدود کے اندر کریں تو اچھے نتائج کے ساتھ کامیابی ہوگی۔

قرآنِ کریم میں خداوندی قوانین کی تکمیل (6:116) کے بعد ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا (33:40) اور ان نقوشِ قدم کو جو رسول اللہ ﷺ نے چھوڑے، قیامت تک کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دے دیا گیا (33:21) جس کا انداز یہ ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)

مفہوم: اُن سے کہو کہ میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف، دلائل وبراھین کی رُو سے، علیٰ وجہِ البصیرت، دعوت دیتا ہوں ۔۔۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔''

وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ کے سلسلہ میں اسوۂ حسنہ کی معراج کا اظہار خود نبی کریم ﷺ کی زبانی اس طرح کرایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ (6:162-163)

مفہوم: ''ان سے کہہ دیں کہ (اس دین کو اس انداز سے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ) میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، میرا مرنا اور میرا جینا خدا رب العالمین کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف ہے۔ میں اس میں کسی اور مقصد' جذبہ یا خواہش کو شریک نہیں کرتا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔''

رسول کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بارے میں یہ چند گلہائے عقیدت تھے جنہیں آپ کی تسکین اور راہنمائی کے لئے پیش کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ ارضی کے بے شمار شعبے ہیں جو نوعِ انسان کی تا قیامت راہنمائی کرتے رہیں گے۔ میرے نزدیک علامہ محمد اقبالؒ کے الفاظ میں:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ہمارے نزدیک تو ان کے نقوشِ قدم انسانی راہنمائی کے لئے قیامت تک جگمگ جگمگ کرتے رہیں گے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تھا نظامِ مصطفیٰ ﷺ!

عیدِ میلادالنبی ﷺ 1979ء کی تقریبِ سعید پر پرویزؒ صاحب کا خطاب

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے — نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

عالمِ انسانیت کی جس عظیم ترین ہستی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تقریبِ میلاد منانے کے لئے ہم آج اپنے لئے سرمایۂ سعادت اور توشۂ آخرت حاصل کرنا چاہتے ہیں اُس کے تذکارِ جلیلہ کی عالمگیریت کے متعلق علّامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ اُسے:

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں دیکھ — بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں دیکھ
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں دیکھ — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں دیکھ
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے — رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ خود ارشادِ خداوندی ہے۔ یعنی باری تعالیٰ نے کہا تھا کہ اے رسول ﷺ! ہم تمہاری رفعتِ شان کے تذکرہ کو انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچا دیں گے۔ بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں، اپنے تو ایک طرف، غیروں تک نے جن شاندار الفاظ میں ہدیۂ تحسین وتبریک پیش کیا ہے اسے یکجا کیا جائے تو اس سے ضخیم مجلّدات مرتب ہو جائیں۔ لیکن میں، اپنے آج کے خطاب کا آغاز ایک ایسے اعتراف سے کرنا چاہتا ہوں جو تازہ ترین بھی ہے اور عظیم ترین بھی۔ حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو (غالباً) ابھی تک پاکستان میں نہیں پہنچی۔ کتاب کا نام ہے۔ ''تاریخ کی ایک سو عظیم ترین شخصیتیں'' اور اس کا مؤلف

کتاب کا نام ہے۔ ''تاریخ کی ایک سو عظیم ترین شخصیتیں'' اور اس کا مؤلف ہے (H.HART) جو افلاکیات اور تاریخ کا عالم ہے۔ اس میں اس نے تاریخِ انسانیت (یعنی کسی خاص قوم، خاص ملک یا خاص زمانہ کی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت کی تاریخ) کی ایسی ایک سو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے معیار کی رُو سے، عظیم ترین اور عدیم النظیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں سب سے اوپر (پہلے نمبر پر) کس شخصیت کا نامِ نامی ہے؟ اس ذاتِ گرامی کا جسے خالقِ کائنات نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کہہ کر پکارا اور جس کی شان میں رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ارشاد فرمایا___

ہے(H.HART) جو افلاکیات اور تاریخ کا عالم ہے۔اس میں اس نے تاریخ انسانیت (یعنی کسی خاص قوم، خاص ملک یا خاص زمانہ کی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت کی تاریخ) کی ایسی ایک سو شخصیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے معیار کی رُو سے، عظیم ترین اور عدیم النظیر ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں سب سے اوپر (پہلے نمبر پر) کس شخصیت کا نامِ نامی ہے؟ اس ذاتِ گرامی کا جسے خالقِ کائنات نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کہہ کر پکارا اور جس کی شان میں وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ارشاد فرمایا___ ہارٹؔ نے کہا ہے کہ میں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کا اسمِ گرامی اس لئے سرِ فہرست رکھا ہے کہ:

> تاریخِ عالم میں وہ واحد شخصیت ہے جسے مذہب اور دنیاوی امور دونوں میں عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی۔

> یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہوجائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

اس نے لکھا ہے کہ اس فہرست کے مرتب کرنے میں مَیں نے کسی شخصیت کے انفرادی کردار کو معیار نہیں قرار دیا۔ معیار یہ پیشِ نظر رکھا ہے کہ اس نے پوری تاریخ اور دیگر انسانوں کو کس حد تک متاثر کیا اور اس معیار کی رو سے مجھے محمد (ﷺ) بلند ترین سطح پر فائز نظر آتے ہیں۔ ہارٹؔ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی عدیم النظیر کامیابی کے سلسلہ میں مذہب اور امورِ دنیا کا الگ الگ ذکر اس لئے کیا ہے کہ ان کے ہاں یہ دونوں شعبے الگ الگ ہیں جن کا ایک دوسرے سے تعلق نہیں۔ لیکن حضور ﷺ نے، اقدارِ خداوندی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط تھا اور جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

رسول کی بعثت کا مقصد:

ہمارے ہاں چونکہ اسلام، دین کے بجائے مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے اس لئے رسول کی بعثت کا مقصد وعظ و نصیحت یا نماز روزہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب جو ''نظامِ مصطفےٰ ﷺ'' کی اصطلاح عام ہوئی ہے تو اس میں بھی اس نظام کا کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں لایا گیا۔ بات نماز، روزہ یا تعزیرات تک ہی محدود رکھی جاتی ہے۔ ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا تھا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے:

> ''رسولؑ اس لئے آتا ہے (یعنی آتا تھا) کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ (مضرابِ وحی سے) اس کے نفسِ قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کردیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل

ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (علیہ الرحمۃ) اپنی کتاب تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:

چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں دنیا توحید کو فراموش کر چکی تھی اس لئے اس زمانے میں توحید کی اشاعت اور طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکر کی عبادتیں جاری کرنے کے احکام نازل ہوئے [1]۔ مگر چونکہ ہمارے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی اور معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے، اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا۔ (جو ان خرابیوں کا سرچشمہ تھیں۔)

(جلد اوّل، ص:66)

حضور ﷺ کی مکی زندگی:

بعض کوتاہ بینوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب تک حضور ﷺ مکہ میں رہے، اسلام کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھا لیکن جب مدینہ میں مملکت حاصل ہوئی تو سیاسی، معاشرتی، معاشی شعبوں کو مذہب کے دائرہ میں لے آیا گیا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نبوّت کے آغاز ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا:

ہمارے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی اور معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے، اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کر دیا۔ (جو ان خرابیوں کا سرچشمہ تھیں۔)

''یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے

---

(1) ہم شاہ صاحب کے اس خیال سے کلیۃً متفق نہیں۔ دین شروع سے ایک ہی چلا آ رہا ہے اس لئے ہر رسول کی بعثت کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی رسول کے زمانے میں جو خرابی سب سے زیادہ فساد انگیز ہوتی تھی وہ اس کے استیصال کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ قرآنِ کریم شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ملک عظیم (عظیم مملکت) عطا ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ مملکت کے فرائض اور ذمہ داریاں نماز، روزہ تک محدود نہیں ہوتیں اگرچہ یہ بھی اس کے نظام کے اہم ستون ہوتے ہیں۔

لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالا دست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے حکومتِ خداوندی کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

مقصدِ رسالت:

اسی ضمن میں تاریخ الکامل ہی میں ایک اور واقعہ مذکور ہے۔ لکھا ہے:

> نبوّت کے آغاز ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر مملکت کا نظام تھا۔ مکی زندگی اس مقصد کے حصول کی تیاری کا زمانہ تھا کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔

شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبوی میں حاضر تھے کہ قبیلہ عامرؓ کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصاء ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضور ﷺ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ: **لکل قول حقیقة، وما حقیقة قولك۔** ''ہر دعویٰ کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور بھائی عیسیٰؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامرؓ نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا، جنت کے باغات۔ اس نے کہا یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا:

نعم النصر و التمکین فی البلاد

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔

اس سے واضح ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا جا سکے جس کی نظیر کہیں نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔

یہ تو میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس مختصر سے وقت میں اس نظام کے تمام گوشوں کو آپ کے سامنے لاسکوں۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اس کے دو ایک اہم پہلوؤں کی خفیف سی جھلک آپ کو دکھا دوں۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظام (یعنی دینِ خداوندی) کے ماحصل کو ایک شعر میں اس جامعیت سے سمو دیا ہے کہ اس پر غور کرنے سے بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ ۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

میں مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ اس نظام نے حاکم و محکوم کا فرق کس طرح مٹایا اور سائل و محروم کا وجود کس طرح ختم کیا۔ قبل اس کے کہ میں ان فردوس بداماں مناظر کو آپ کے سامنے پیش کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نظام کا

آغاز حضور رسالت مآب ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوا تھا لیکن (اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق) اس کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد مکہ میں حضرت سہیلؓ بن عمر کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ:

> ''خدا کی قسم، اسلام کا مقصد تکمیل تک پہنچے گا۔ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ سنا ہے کہ (آپ نے فرمایا تھا) لوگو! میرے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہو۔ عرب تمہارے تابع فرماں ہوں گے، عجم باجگذار۔ خدا کی قسم، تم قیصر و کسریٰ کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔'' (تاریخ الکامل)

اس دعویٰ کی تکمیل خلفائے راشدینؓ کے ہاتھوں ہوئی تھی، بالخصوص حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں۔ لہٰذا میں جو مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا ان کا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد سعادتِ مہد ہی سے نہیں، بلکہ (قرآن کے الفاظ میں) والذین معہ، کے زمانے سے بھی ہوگا۔ مَیں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس نظام کی تکمیل اُس زمانے کے تقاضوں کے مطابق، صدرِ اوّل میں ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ قرآنِ کریم تو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطہء نظام ہے۔ جن اصول و اقدار کے مطابق یہ نظام متشکل ہوگا، وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن اس کی جزئیات اور طرق و اسالیب مرورِ زمانہ کے ساتھ عند الضرورت بدلتے جائیں گے۔ لہٰذا جوں جوں انسانی زندگی کے تقاضے وسیع ہوتے جائیں گے، یہ نظام بھی اس کے مطابق وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآنی راہنمائی حدود فراموش ہے، اسی طرح، اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام بھی قیود نا آشنا ہے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ (13:35) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (14:25)

> آغازِ نبوت ہی سے حضور ﷺ کے پیشِ نظر ایک مملکت کا حصول تھا جس میں ایسا نظام قائم کیا جاسکے جس کی نظیر کہیں نہ ملتی ہو۔ یہی مقصودِ رسالت تھا۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ!

❀❀❀❀

نہ حاکم نہ محکوم:

اب میں اس نظام کے پہلے گوشے کی طرف آتا ہوں۔ یعنی اس امر کی وضاحت کی طرف کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہوگا، نہ محکوم۔ انسانی نظامِ مملکت میں (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جب حکومت قائم ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ حاکم اور محکوم کے بغیر تو حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا! لیکن انسانی نظام اور خدائی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ نظامِ خداوندی میں، اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین

کی ہوتی ہے، اور قوانین ایسے جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ خود خدا کے نازل فرمودہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، اور جسے ہم حکومت کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اِسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرماں روائی کو بطیبِ خاطر قبول کرلیں ان پر ان کا اطلاق ہوگا۔ انہی کو اُمتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ ان قوانین کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تغیر وتبدل یا حک واضافہ نہیں ہوسکے گا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس نظام میں نہ صرف یہ کہ کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوگا بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس کا کلی اطمینان ہوگا کہ جن قوانین کی اطاعت انہوں نے بطیبِ خاطر اختیار کی ہے ان میں کبھی، ردّ وبدل نہیں ہوگا۔

فرماں روائی صرف قانون کی:

جہاں تک محکومیت کا تعلق ہے، تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ سیاسی محکومیت کے مقابلہ میں، مذہبی پیشواؤں کی محکومیت زیادہ متشدد اور سخت گیر ہوتی ہے۔ اس نظام میں جہاں سیاسی محکومیت کو ختم کیا گیا وہاں، مذہبی پیشوائیت کے اقتدار ہی کو نہیں، اس کے وجود تک کو معدوم کردیا گیا۔ قرآنِ کریم نے یہود ونصاریٰ کے متعلق کہا ہے کہ: اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (9:31) ’’انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔‘‘ اس آیت کی تفسیر میں حضور ﷺ نبی اکرم کا ارشادِ گرامی نہایت واضح اور تابناک ہے:

حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے دیکھ کر فرمایا ’’عدیؓ! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔‘‘ اس وقت آپ سورۂ براۃ (توبہ) تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ ’’اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (9:31)۔۔۔ تو میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا! مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کردیتے ہیں اور تم حلال سمجھنے لگتے ہو اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کردیتے ہیں اور تم حرام سمجھنے لگتے

> نظامِ خداوندی میں، اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے، اور قوانین ایسے جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں، بلکہ خود خدا کے نازل فرمودہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، اور جسے ہم حکومت کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔

ہو۔ میں نے اقرار کیا! بیشک واقعہ یہی ہے تو فرمایا یہی تو انہیں خدا بنالینا ہے۔ (جامع بیان العلم، ابن عبدالبر)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنینؓ! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپؓ نے فرمایا: ''کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں''۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ: ''یاد رکھو! تم سے پہلی اُمتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا___ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔'' (شاہکارِ رسالت، ص:72)

یوں اس نظام نے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو ختم کر دیا۔ اس میں قانونِ خداوندی کا نفاذ بھی مملکت کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تشریح وتعبیر کا فریضہ بھی مملکت ہی ادا کرتی تھی۔

یوں اس نظام نے مذہبی پیشواؤں کے وجود کو ختم کر دیا۔ اس میں قانونِ خداوندی کا نفاذ بھی مملکت کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تشریح وتعبیر کا فریضہ بھی مملکت ہی ادا کرتی تھی۔

اس نظام کی اوّلیں مرکزی اتھارٹی، حضور نبی اکرم ﷺ کو ارشاد تھا کہ: ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48)''۔ ''ان کے معاملات کے فیصلے قرآنِ مجید کے مطابق کرو۔'' حضور ﷺ نے اس کتابِ خداوندی کے مطابق سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی۔ عمر بھر اسی کے مطابق فیصلے فرماتے رہے، اور دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، پوری اُمت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ___ کتاب اللہ۔

(بخاری، باب حجۃ الوداع)

مَیں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہ ہو گے___ وہ ہے کتاب اللہ۔

حضور ﷺ کے بعد، آپ کے سچے جانشین اپنے زمانے میں اس مسلک پر قائم رہے کیونکہ یہ ارشادِ خداوندی ان کے سامنے تھا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٤﴾ (5:44)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں اپنے لئے دعا یہ مانگی تھی کہ:

''یا اللہ! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔''

اور سامعین سے کہا تھا کہ:

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اس پر عمل کرو تا کہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔

(شاہکارِ رسالت، ص:66)

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ ''میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری بات مانیں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے آپ اس کے مطابق مشورہ دیں۔'' آپ کے عہد میں عمالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلیں معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن میں تفقہ کر سکتے ہیں۔ جب مکہ کے گورنر نافع بن عمرؓ بن عبدالحارث نے عبدالرحمانؓ بن ابزی کو وادی کا والی مقرر کیا تو حضرت عمرؓ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ وہ شخص قرآن مجید میں تفقہ کرتا ہے اور دین کے فرائض کا علم رکھتا ہے۔ تو آپ بہت خوش ہوئے۔ قرآنِ کریم کی اہمیت وعظمت آپ کے رگ و پے میں اس حد تک سرایت کئے ہوئے تھی کہ جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقعہ ہوگئی تو کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آ چکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔ تو آپ نے ان سے کہا کہ:

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لیے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردد نہ ہوں۔ جہنم کی آگ آپ کو چھو نہ سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس سے کہا کہ بھائی! تمہارا علم اس بارے میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف سے نچھاور کر دیتا۔'' آپ نے یہ الفاظ کہے تو حضرت ابن عباسؓ نے جو آپ کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ ''یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حقوق برابر عطا کرتے تھے۔'' یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا! ابن عباسؓ! کیا تم میرے بارے میں اس امر کی شہادت دو گے؟ وہ خاموشی سے سنتے رہے تو آپ نے دوبارہ کہا کہ کہو ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے

کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے، حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کے الفاظ میں، اس کی عام گواہی دی کہ:

عمرؓ ـــــ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہہ۔

میں نے ان حضرات (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے تفقہ کا ذکر اس لئے خاص طور پر کیا ہے کہ اسلامی مملکت میں، فقہا اور علماء کا الگ وجود نہیں ہوتا تھا۔ سربراہِ مملکت اور عمالِ حکومت ہی فقہاء اور علماء ہوتے تھے۔ اس دور میں نہ اُمت میں الگ الگ فرقے تھے، نہ ان کی الگ الگ فقہیں ـــــ ایک اُمت تھی۔ ان کی ایک مرکزی اتھارٹی ـــــ وہی اتھارٹی قرآنی قوانین نافذ کرتی تھی اور وہی ان قوانین کی فقہی تعبیرات کا حق رکھتی تھی۔ کسی اور کو ان کی تعبیرات اور تشریحات کا حق اور اختیار نہیں تھا، بعینہٖ جس طرح آج مملکت کے قوانین کی تعبیرات کا حق نمائندگانِ حکومت کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ چونکہ مملکت کی بنیاد کتاب اللہ پر تھی اسی لئے کتاب اللہ مملکت کے گوشے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ امام ابنِ حزم کی تحقیق کے مطابق عہدِ فاروقی میں قرآن مجید کے کم وبیش ایک لاکھ نسخے مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔ قرآنی تعلیم کی اس قدر عام اشاعت کا نتیجہ تھا کہ اُمت قرآنی اور غیر قرآنی امور میں خود امتیاز کرسکتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

> امورِ مملکت کے فیصلے تو قرآنِ مجید کے اصول، اقدار اور احکام کے مطابق ہوتے تھے جو غیر متبدل تھے لیکن ان کی جزئیات کا تعلق اور ان کے نافذ کرنے کا پروگرام باہمی مشاورت سے طے پاتا تھا۔ اس مشاورت میں بھی اصول یہی کارفرما ہوتا تھا کہ یہ مشورے حدود اللہ کے مطابق ہوں۔

حاکم کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کررہی ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔

وحی اور رائے میں فرق:

امورِ مملکت کے فیصلے تو قرآنِ مجید کے اصول، اقدار اور احکام کے مطابق ہوتے تھے جو غیر متبدل تھے لیکن ان کی جزئیات کا تعلق اور ان کے نافذ کرنے کا پروگرام باہمی مشاورت سے طے پاتا تھا۔ اس مشاورت میں بھی اصول یہی کارفرما ہوتا تھا کہ یہ مشورے حدود اللہ کے مطابق ہوں۔ جب عراق کی زمینوں کے متعلق اہم سوال زیرِ بحث آیا (جس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) تو حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو تقریر فرمائی ـــــ اس میں کہا:

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے

میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی اور بعض نے مدافعت، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس باب میں آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ ''اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے۔'' آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور کہا کہ ''تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔'' اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: ''یاد رکھو! رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت نہ بناؤ۔'' عمرؓ کی رائے ہی نہیں۔ کسی ایک اسلامی مملکت کے وضع کردہ قوانین بھی ابدی نہیں ہوتے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بعد میں آنے والی اسلامی مملکت تبدیلی کرسکتی ہے۔ اس اہم اصول کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کی رُو سے آپ نے فرمایا:

> تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: ''یاد رکھو! رائے غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت نہ بناؤ۔'' عمرؓ کی رائے ہی نہیں۔ کسی ایک اسلامی مملکت کے وضع کردہ قوانین بھی ابدی نہیں ہوتے۔ ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بعد میں آنے والی اسلامی مملکت تبدیلی کرسکتی ہے۔

بیشک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا ہے بنیادی طور پر اس کا تعلق قانون سازی کے اصول سے ہے لیکن بغور دیکھئے تو اس میں وہ عمیق نکتہ بھی پوشیدہ ہے جو دین کی بنیاد ہے یعنی اس میں ساری اہمیت اصولوں کو حاصل ہوتی ہے۔ شخصیتوں کو نہیں۔ قرآن تو آیا ہی شخصیت پرستی کو مٹانے کے لئے تھا۔

❀❀❀❀

شخصیت پرستی:

''شخصیت پرستی'' سے میری نگاہ بلا ساختہ اس عظیم واقعہ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جس کی مثال دنیائے مذاہب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی، شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہے، خواہ یہ شخصیت پرستی، دنیاوی حکمرانوں کو ''ظل اللہ علی الارض'' (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور

خواہ روحانی پیشواؤں کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی دوسری شکل، پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ دنیاوی حکمرانوں کی محکومیت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کرسکتی ہیں لیکن روحانی پیشوائیت کی محکومیت کا تسلط انسان کے قلب و دماغ اور روح پر ہوتا ہے۔ اگر کسی (زندہ یا مردہ) ''حضرت صاحب'' کی شان کے خلاف خیال تک بھی ان کے کسی معتقد کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے۔ کانپتا ہے۔ لرزتا ہے کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے وہ ان کے حضور (اگر وہ زندہ ہوں تو ان کی بارگاہ میں اور وفات پا چکے ہوں تو ان کے مزار کی پائنتی کی طرف سجدہ ریز ہوکر) روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ معافیاں مانگتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے، معاف کردیجئے، ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا۔ دین اور دنیا میں کہیں کا نہیں رہوں گا ـــ سوچئے کہ کیا شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے فروتر کوئی اور صورت بھی ہوسکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا، اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی! خود حضور ﷺ رسالتمآب کا (زبانِ وحی کی رو سے) یہ ارشاد کہ: انا بشر مثلکم (میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں) شخصیت پرستی کی جڑ پر تبر کی ضربِ کاری کے لئے تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں اس کی جو مثالیں پیش کیں انہیں آپ سیرتِ طیبہ پر میری پیش کش، معراجِ انسانیت، میں دیکھیئے۔ لیکن میں اس وقت اس باب میں حضور ﷺ کی سیرتِ اقدس کی کوئی مثال پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے اپنی تعلیم و تربیت سے اپنے متبعین میں جو قلبِ ماہیئت پیدا کردی تھی، اس سے ان حضرات کی کیفیت کیا ہوگئی تھی۔ (جیسا کہ قرآنِ کریم سے واضح ہے) نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت، ایک درخت کے نیچے صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے خصوصیت سے نماز ادا کرتے ہیں۔

طبیعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ بیعتِ رضوان کا درخت ایک فردوس بداماں واقعہ کی یاد تازہ کراتا تھا اور صحابہؓ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے، محض اس کے نیچے نماز ادا کرتے تھے۔ نظر بظاہر اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ لیکن اس دست پروردۂ نبوت کی نگاہِ حقیقت شناس اس معصوم سی ابتداء سے آنے والے خطرات کو بھانپ رہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ غیر شعوری طور پر اس درخت کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو رہی ہے جو آگے چل کر خطرناک شکل اختیار کرسکتی ہے۔ اس کا ایک ہی علاج تھا۔ اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ علاج تو اس کا یہی تھا لیکن ایسا کرنے کے لئے، اور تو اور، خود اپنے جذبات کا بھی جس جرأت سے مقابلہ کرنا تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر دین کا تقاضا جذبات پر غالب نہ آجاتا تو عمرؓ ابن خطاب، فاروقِ اعظمؓ کس طرح بن جاتا۔ چنانچہ آپ نے پوری ہمت اور جرأت سے فیصلہ کیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کٹ گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ:

انما هلك من قبلكم بهذا يتبعون اٰثار انبياء هم فاغذوها كنائس وبيعا۔

تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے محسوس آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنالیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

اراء کم ایھا الناس رجعتم الی العزیٰ۔

تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس سے تم بت پرستی کی طرف لوٹ رہے ہو؟

❁❁❁❁

کیسی دُور رس نگاہ تھی اس متعلّمِ درس گاہِ نبویؐ کی؟ آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا، لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمت اس خطرہ کے بیجوں کی جھولیاں بھر بھر کرلے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سوسو پرستش گاہیں وجود میں آ جائیں۔ جہاں اس توحید کی مدعی اُمت کے سر اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے۔ بہرحال، عمر فاروقؓ ان بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی جڑ کاٹ کر اُمت کے لئے ایک نظیر قائم کر دی تھی۔ لیکن جب اُمت نے قرآن ہی کو چھوڑ دیا تو اس قسم کے نظائر ان کے لئے کس طرح عبرت آموز ہو سکتے ہیں۔

کیسی دُور رس نگاہ تھی اس متعلّمِ درس گاہِ نبویؐ کی؟ آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا، لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمت اس خطرہ کے بیجوں کی جھولیاں بھر بھر کرلے جائے گی اور انہیں ساری دنیا میں بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سوسو پرستش گاہیں وجود میں آ جائیں۔ جہاں اس توحید کی مدعی اُمت کے سر اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے۔

اس سلسلہ میں دو ایک اور واقعات بھی عبرت آموز ہیں۔

ایک دفعہ آپ حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس کی طرف لوگ دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ لوگ تبرکاً اس میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جس شخص کو اس مسجد کے قریب نماز کا وقت آ جائے وہ تو اس میں جا کر نماز پڑھ لے۔ لیکن بہ تکلف اس میں کوئی نماز نہ پڑھے۔

آپ نے ایک دفعہ سنا کہ ایک قبر ہے جسے لوگ حضرت دانیالؑ کی قبر سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس قبر کو چھپا دیا جائے۔

میں ان واقعات کے بعد اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

عدل:

بات میں یہ کررہا تھا کہ نظامِ خداوندی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محکومیت صرف قوانین خداوندی کی اختیار کی جاتی ہے۔کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی نہیں۔لیکن یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ قانون خواہ کیسا ہی بلندو بالا ہو، اس کے انسانیت ساز نتائج اسی صورت میں برآمد ہو سکتے ہیں کہ اس قانون کو نافذ کرنے والے عدل کی میزان کو تھامے ہوئے ہیں۔عدل کسے کہتے ہیں اسے قرآنِ کریم نے ان چار الفاظ میں منضبط کرکے سمجھا دیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک عظیم رسول، حضرت داؤدؑ کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ: يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (38:26)''اے داوٗد! ہم نے تمہیں ملک میں صاحبِ اقتدار اس لئے بنایا ہے کہ تم لوگوں کے امور کے فیصلے الحق (وحی خداوندی) کے مطابق کرو، اور ایسا کرنے میں اپنے جذبات، میلانات، خواہشات کا اتباع نہ کرنے لگ جاؤ۔'' لہٰذا عدل سے مراد یہ ہے کہ صاحبِ اقتدار، قانون کے نفاذ میں اپنے رجحانات اور جذبات کو یکسر الگ رکھے اور انسان اور انسان میں کسی قسم کی تفریق اور تمیز نہ کرے۔یہ ہے وہ بنیادی خصوصیت جس سے یہ نظام، عدیم النظیر قرار پاتا ہے۔جب اسلامی نظام قائم ہوا تھا تو قانون نافذ کرنے والے، اپنے جذبات اور میلانات کو کس طرح الگ رکھتے تھے، کتب سیر و آثار میں اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں، لیکن قلتِ وقت کی وجہ سے میں اس وقت ان میں سے صرف چند ایک پیش کرسکوں گا۔

یہودی کی لڑائی:

سب سے پہلے سیرت طیبہ کے ایک واقعہ کو لیجئے جو ہے تو مختصر سا لیکن اس میں قانون اور ذاتی جذبات کو نکھار کر الگ الگ کردیا گیا ہے۔حضور ﷺ کی انصاف پروری اور معدلت گستری اس قدر مسلم اور پُراعتماد تھی کہ یہودی بھی، باوجود اس قدر مخالف ہونے کے، اپنے اہم مقدمات حضور ﷺ کی عدالت میں لایا کرتے تھے۔آپ ﷺ نے قتل کے ایک مجرم کو موت کی سزا کا حکم سنایا۔جلاد اس کے سر پر تلوار لئے کھڑا آخری اشارے کا منتظر تھا کہ اتنے میں اس مجرم کی ایک خورد سالہ بچی روتی، چیختی، چلاتی دوڑی دوڑی آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ کر فریاد کی کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجئے۔اس کی آہ وفغاں اس قدر رقت آمیز تھی کہ حضور ﷺ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ سزائے موت کا حکم واپس لے لیں گے۔لیکن آپ نے بچی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور جلاد کو قتل کا اشارہ دے دیا۔بعد میں صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، اس کے باوجود آپؐ نے قتل کا حکم دے دیا۔یہ متضاد کیفیت کیوں تھی؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے جو فقرہ ارشاد فرمایا وہ تاریخ میں کلاسک کی حیثیت رکھتا ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ: ''اس وقت محمد ﷺ ابن عبداللہ کی آنکھ روتی تھی اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ خدا کا قانون نافذ کر رہا تھا۔'' محمد ﷺ ابن عبداللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا یہی وہ نازک فرق ہے جو قانون کی بالادستی کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے۔

بیٹی کا ہار:

اور یہ فرق حضور ﷺ کی ساری زندگی میں درخشاں ستاروں کی طرح جگ مگ، جگ مگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جنگِ بدر کے قیدیوں میں حضور ﷺ کے داماد ابوالعاص رضی اللہ عنہ بھی تھے (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) فیصلے کے مطابق ان قیدیوں کا زرِ فدیہ طلب کیا گیا تو حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ایک ہار بطور فدیہ بھیجا۔ ہار سامنے آیا تو گذشتہ تیس سال کے واقعات ایک ایک کر کے آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ یہ وہ ہار تھا جسے حضور ﷺ نے اپنے نکاح کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تحفۃً دیا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہی ہار حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی پر الوداعی تحفہ کے طور پر بیٹی کے زیبِ گلو کیا تھا۔ کانچ کے اس ہار کی قیمت تو کیا ہو سکتی تھی لیکن محبت اور رفاقت کے مقدس جذبات کی ایک دنیا اس میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ آپ ﷺ فوج کے کمانڈر انچیف بھی تھے اور سربراہِ مملکت بھی۔ آپ ﷺ بلا تامل اس ہار کو ڈھیر سے الگ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرنے سے اصولِ عدل پر زد پڑتی تھی۔ آپ نے مجلسِ مشاورت کو اس ہار کی تاریخ سے آگاہ کیا اور کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اسے بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ ان کی تصویب سے ہار واپس کیا گیا۔ بات تو چھوٹی سی ہے لیکن جو اصول اس میں کارفرما ہے وہ قیامت تک ہر صاحبِ اقتدار کے لئے اسوۂ حسنہ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ:

اور اس کے بعد اس واقعہ کو سامنے لایئے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخر ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے اپنے اوراق میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ واقعہ متعلق ہے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ ایک غلام تھے، جسے حضور ﷺ نے آزادی عطا فرمائی تھی۔ ایک غلام کا آزاد ہو جانا ہی کچھ کم باعثِ شرف نہ تھا کہ اس کے بعد آپ نے اسے منہ بولا بیٹا بنا لیا (1) اور اس کی پرورش خود اپنے گھر میں کی۔ اصولِ مساوات اور تکریمِ آدمیت کی عملی مثال پیش کرنے کی غرض سے آپ نے اس کی شادی بنو ہاشم کی ممتاز ترین خاتون، اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کر دی۔ سوءِ اتفاق کہ وہ شادی کامیاب نہ ہو سکی اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔ آپ غور کیجئے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ ارادہ آپ پر کس قدر شاق گذرا ہوگا۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ حسب و نسب کو طرۂ امتیاز سمجھنے والے قریش اس شادی پر پہلے ہی معترض تھے۔ اس کی ناکامی پر انہیں یہ کہنے کا موقعہ مل جاتا کہ ___ کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے! ___ آپ ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:

اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ (33:37) اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمایئے کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جا رہا ہے۔ کہنے والا خدا کا رسول ﷺ ہے۔ جس پر ایمان لانے سے حضرت زید رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے ہیں۔ کہنے والا سربراہِ مملکت بھی ہے۔ کہنے والا محسن ہے جس نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو غلامی سے آزاد کیا۔ کہنے والا بمنزلہ باپ کے ہے اور پھر کہنے والا اس معزز خاتون رضی اللہ عنہا کا برادرِ بزرگ بھی ہے۔

کہئے کہ اس کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اس کی جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ آپ ﷺ کے اس فرمان کی خلاف ورزی کرے۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سوچئے کہ آج اگر کسی پیر کا مرید۔ کسی افسر کا ماتحت، کسی حاکم کا محکوم، کسی محسن کا ممنون احسان، کسی باپ کا بیٹا، کسی بڑے کا چھوٹا ایسا کرتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی! لیکن وہاں کیا ہوا۔ نہ کہنے والے کے ماتھے پر کوئی شکن آیا نہ زیدؓ پر کوئی عتاب نازل ہوا۔ نہ باہمی تعلقات میں کوئی فرق آیا۔ اس لئے کہ وہاں تو سکھانا یہ مطلوب تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے ذاتی فیصلوں کا پابند بنائے خواہ جذبات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضور ﷺ کا یہ حکم نہ بحیثیت رسول ﷺ تھا، اور نہ بمنصبِ سربراہِ مملکت، یہ ایک ذاتی مشورہ تھا۔ اور بتانا یہ مقصود تھا کہ مشورہ دینے والے کی پوزیشن کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے نہ ماننے سے کسی قسم کا عتاب اور سرزنش تو ایک طرف، دل میں ذرا سی کدورت اور رنجش بھی نہیں آنی چاہئے۔ قرآنِ کریم نے قانون، احکام اور مشورہ کے اسی فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اس واقعہ کو اپنے اوراق میں محفوظ کیا ہے تاکہ یہ آنے والوں کے لئے دلیلِ راہ بنے ــــــ لیکن آپ غور کیجئے کہ آج غیر تو غیر، خود حضور ﷺ کے نام لیواؤں میں سے کتنے ہیں جو اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اور یہ تو پھر بھی حضور ﷺ کے ایک عزیز کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں بریرہؓ نامی ایک لونڈی تھی جو آزادی حاصل ہونے کی بنا پر اپنے سابقہ شوہر حضرت مغیثؓ، سے الگ ہوگئی تھی۔ حضرت مغیثؓ کی درخواست پر حضور ﷺ نے بریرہؓ سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے کو واپس لے لے۔ آپ سوچئے کہ اس لونڈی سے یہ کہنے والا کون تھا؟ لیکن وہاں تو نظام ایسا قائم کر دیا گیا تھا جو حریت اور آزادی کی فضا سے معمور تھا۔ بریرہؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ ﷺ مجھے اس کا حکم دے رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے معاملات میں، مَیں حکم تو نہیں دے سکتا۔ یہ محض ایک مشورہ ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ معاف فرمایئے۔ مَیں اس مشورہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں ـــــ اور حضور ﷺ ایک تبسمِ عاجز نواز کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

جہاں تک خود اپنی ذات کا تعلق ہے حضور ﷺ نے مرض الموت کے دوران اعلان فرمایا:

> لوگو! اگر مَیں (ﷺ) نے کسی کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو تو میری پیٹھ حاضر ہے۔ وہ مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔ اگر میری زبان سے کسی شخص کے متعلق کوئی ناروا بات نکل گئی ہو تو وہ اسی طریق سے مجھ سے اپنا انتقام لے لے۔ اگر میرے ذمے کسی کا کوئی قرض ہو تو وہ مجھ سے وصول کر لے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے میرے دل میں کسی قسم کا بغض یا کدورت پیدا نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں صرف ایک شخص نے کھڑے ہو کر تین درہم کا مطالبہ کیا جو آپ ﷺ نے ادا فرما دیئے۔

خطباتِ خلافت:

حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ تو اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے لیکن قلتِ وقت کے احساس سے مجھے آگے بڑھ جانا چاہئے اور اس فردوس بداماں داستان کے اگلے باب کی ابتداء حضرت صدیقِ اکبرؓ کے اس خطبہ سے کرنی چاہئے جسے آپ نے منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد ارشاد فرمایا۔ آپؓ نے کہا:

اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں۔ اگر میں صحیح کام کروں تو اس میں میری مدد کرو۔ اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمہ ہے____ (الخ)

حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت کا آغاز اس طرح فرمایا:

لوگو! مَیں (رضی اللہ عنہ) تم میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی گوارہ ہو سکتی تو مَیں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین کہو۔

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا:

بارِ الٰہا! مَیں سخت ہوں، مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔

یہ کہہ کر آپؓ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے امین کہا تو آپؓ نے بدرگاہِ رب العزت عرض کیا:

یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تا کہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپؓ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے امین کہا تو آپؓ نے تیسری دعا مانگی کہ:

الٰہا العالمین! میں بخیل ہوں، مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریا کاری کا شائبہ نہ ہو۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا:
قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی کے مطابق عمل کرو تا کہ تم عاملِ قرآن ہو جاؤ۔

مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپؓ نے فرمایا:

ایھا الناس! اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا ہے تا کہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ میرے سامنے تمہارا جو معاملہ آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہوگا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہوگی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو مَیں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا۔ اگر غلط رویہ اختیار کریں گے تو انہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا:

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی کے مطابق عمل کرو تا کہ تم عاملِ قرآن ہو جاؤ۔

اپنے آپ کا محاسبہ کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد آپ نے اپنے لئے وہ دعا مانگی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔اس میں آپ نے کہا کہ:

اس کے بعد آپ نے اپنے لئے وہ دعا مانگی جس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔اس میں آپ نے کہا کہ: بارِالٰہا! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کرسکوں۔تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔

بارِالٰہا! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تا کہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کرسکوں۔تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔

ایک دوسرے خطبے میں جو اس سے زیادہ مفصل تھا آپ نے کہا:

اے لوگو! اب جبکہ تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔لیکن اس تمام سختی کے باوجود میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جنہیں میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں تا کہ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرلو۔

(1) تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

(2) تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے وظائف میں اضافہ کروں۔(تا کہ تم خوشحالی کی زندگی بسر کرسکو) اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں (تا کہ تم بیرونی خطرات سے محفوظ ہو جاؤ)۔

(3) تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہیں خواہ مخواہ خطرات میں نہ ڈالوں۔تمہیں بلاضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکوں۔اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہ پرداخت کروں۔

ان کے مقابلے میں میرا تم پر صرف ایک حق ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اللہ تمہیں عطا کرے اس میں سے اپنے لئے صرف اتنا لے لوں جو میری اور میرے بال بچوں کی ضروریات پورا کر سکے۔

تمہاری جو ذمہ داریاں اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے حفاظت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب کا منتظر ہوں جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اُسے کیسے خرچ کیا۔

قادسیہ کی عظیم فتح کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

واللہ! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنالوں۔ میں تو خود خدا کا غلام ہوں۔ اس نے میرے سپرد ایک امانت کردی ہے۔ اگر میں اِسے اس طرح استعمال کروں کہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں اور تمہیں گھر بیٹھے سیراب کردوں تو میں سعادت مند ہوں اور اگر میں اس امانت کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں تو میں بہت بدبخت ہوں گا کہ چند دن عارضی طور پر خوش ہولوں اور پھر ابدی غم والم میرے حصے میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس خیانت کے جرم سے مجھے کبھی معافی نہیں مل سکے گی اور نہ مَیں واپس بھیجا جاؤں گا کہ تمہیں آ کر راضی کرلوں۔

خلیفہ یا بادشاہ:

یہ تھے نظامِ خداوندی قائم کرنے والوں کے عزائم و مقاصد اور یہ تھا انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور یہی احساس تھا جس کی بنا پر آپ نے ایک دن کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ کیونکہ اگر بادشاہ ہوں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس پر مجمع میں سے ایک شخص برجستہ بولا کہ ''خلافت اور شہنشاہیت میں بڑا فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے نہ ناجائز کچھ خرچ کرتا ہے۔ اس کے برعکس بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔ للہ الحمد کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں ہیں۔ اس پر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ بدرگارِ احکم الحاکمین سجدہ ریز ہو گئے۔

ان حضرات کے اس قسم کے عہد و پیمان کے بعد اب میں چند ایک ایسی مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے عدل کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجائے گا۔ عدل کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ قانون کے اطلاق میں کسی شخص کی ذاتی حیثیت کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

جبلہ بن ایہم کا واقعہ:

اس زمانے میں عرب کی شمالی سرحدوں پر قائم عربی قبائل آباد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ان قبائل کے سردار قیصر کی طرف سے اپنے اپنے علاقے کے حاکم تھے۔ وہ وہاں کے بادشاہ متصور ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ کا سردار جبلہ بن ایہم اپنے قبیلہ کے پانچ سو افراد کے ساتھ مسلمان ہوگیا اور مدینہ آ گیا۔ وہاں اُسے بڑی عزت اور تکریم کے ساتھ رکھا گیا۔ حج کے موقع پر وہ حضرت عمرؓ کی معیت میں مکہ آیا۔ طواف کے دوران اس کی چادر کا پلو ایک بدو کے پاؤں تلے آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس بدو کی ناک پر مکہ دے مارا۔ بدو نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور جبلہ نے اس کا اقرار کیا۔ اس پر آپ نے اس سے کہا کہ تم اس بدو کو منا کر صلح کرلو، ورنہ تمہیں اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، مَیں بادشاہ ہوں اور وہ معمولی بدو ہے۔ مَیں اس سے کیسے معافی مانگ سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

''بادشاہ اور بدو میں فرق تمہارے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے۔ اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔ یہاں سب برابر ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ امیر المومنینؓ! میں تو سمجھا تھا کہ اسلام لانے کے بعد مجھے جاہلیت کے مقابلہ میں زیادہ عزت دی جائے گی لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام میں عزت کا معیار تقویٰ ہے اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ تم یا تو اس بدو کو راضی کرو ورنہ سزا کے لئے تیار ہوجاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دی جائے۔ اسے مہلت دے دی گئی۔

اس واقعہ کا خاصہ چرچا ہوگیا۔ بعض لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس معاملہ میں اس قدر سختی نہ برتیں۔ یہ شخص بڑا صاحبِ اثر ہے۔ آپ نے انہیں جواب دیا کہ اگر کسی شخص کی وجاہت کے اثر سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے، تو پھر خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی ملوکیت میں فرق کیا ہوا۔ چنانچہ آپ ذرا نہ جھکے اور جبلہ آپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا اور پھر سے عیسائی ہوگیا۔

اپنے خلاف فیصلہ:

یہ تو دوسرے صاحبِ اثر و وجاہت کا معاملہ تھا۔ خود سربراہِ مملکت کی بات سُن لیجئے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے تو گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہوگیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کردیا۔ آپ نے کہا کہ ''اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کرلو۔'' اس نے کہا کہ ''میں شریح کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔'' انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ ''امیر المومنینؓ! یا تو گھوڑا خریدیئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اسے واپس کیجئے۔'' اس فیصلہ پر آپ بہت خوش ہوئے اور شریح سے کہا کہ ''آپ منصبِ قضا کے لئے نہایت موزوں ہیں۔''_____ یہی ہیں کوفہ کے مشہور قاضی شریح جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمال و حسن و خوبی سرانجام دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے آپ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے ان سے کہا کہ ''زید تم سے انصاف کی اُمید کس طرح کی جاسکتی ہے جب تم نے ابتداء ہی میں فریقین میں امتیاز کرنا شروع کردیا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ مدعی کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ مدعی نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے مدعی سے کہا کہ امیر المومنین سے قسم لینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ بڑے ناراض ہوئے اور کہا کہ زیدؓ! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کرسکتا۔

لیکن اسی قسم کا ایک سہو ایک دفعہ خود حضرت عمرؓ سے بھی ہوگیا تھا۔ ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف آپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ حضرت علیؓ نسبتاً متمیز جگہ پر بیٹھ گئے تو آپ نے کہا۔ ''ابوالحسنؓ! اٹھو اور اپنے مدعی کے مقابل جا کر بیٹھ جاؤ۔'' حضرت علیؓ وہاں جا کر بیٹھ گئے لیکن آپ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ''فریقِ مقابل کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا تھا؟'' ''عمرؓ! مجھے یہ قطعاً ناگوار نہیں گذرا۔ ناگوار یہ گذرا کہ تم نے مجھے تو میری کنیت (ابوالحسن) سے پکارا اور فریقِ مقابل کو اس کے نام سے۔ اس سے تم نے جو

عدم مساوات کا ثبوت دیا، مجھے وہ ناگوار گذرا تھا۔ (واضح رہے کہ عربوں کے ہاں کسی کو نام کے بجائے کنیت سے پکارنا اس کی تعظیم پر دلالت کرتا تھا۔) اوران حضرات کو بارگاہِ عدل میں اتنا سا امتیاز بھی گوارا نہیں تھا۔

اپنا بیٹا:

اور آگے بڑھیئے۔ آپ کے صاحبزادہ عبدالرحمان مصر میں تھے۔ ان سے کوئی لغزش سرزد ہوگئی تو وہ وہاں کے گورنر حضرت عمرؓ بن عاص کے پاس پہنچے اور کہا کہ مجھے قانون کے مطابق اس کی سزا دیجئے۔ انہوں نے کوڑوں سے اس کی سزا تو دی لیکن کسی پبلک مقام کے بجائے اپنے گھر کے اندر سزا دی۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت عمرؓ بن عاص کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا:

> ابن العاصؓ! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمان کو اپنے گھر کے اندر سزا دی۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے۔ عبدالرحمان تمہاری رعایا کا ایک فرد تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے تھا جو دوسرے مجرموں کے ساتھ کرتے ہو۔ لیکن تم نے کہا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے اس لئے اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا چاہئے حالانکہ تمہیں میرے نزدیک کسی شخص سے حق لینے میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے عبدالرحمان کو ایک اونی جبّہ پہناؤ اور پالان پر سوار کر کے مدینہ روانہ کر دو تا کہ وہ اپنے جرم کی قانون کے مطابق سزا پائے۔

اور امیر المومنین کے بیٹے کو قانون کے مطابق سزا دی گئی۔

گورنر کا بیٹا:

اب آگے چلئے۔ اسی گورنر کے بیٹے نے ایک قبطی کو (جو وہاں ذمیوں ــــــ آج کل کی اصطلاح میں غیر مسلم اقلیتوں کی حیثیت سے رہتے تھے) کسی بات پر کوڑوں سے پیٹا۔ وہ اُسے کوڑوں سے پیٹتا جاتا تھا اور جوانی کے جوش میں کہتا جاتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ قبطی نے آ کر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں کو بلا بھیجا۔ اعترافِ جرم پر آپ نے اس قبطی سے کہا کہ ''جس طرح اس نے تمہیں کوڑوں سے پیٹا تھا۔ اسی طرح تم اس کے کوڑے لگاؤ۔'' وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ 'مار بڑوں کی اولاد کو اور مار' وہ اسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمرؓو بن عاص) کے بھی مارو۔ کہ اگر اس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا اور غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمرؓ بن عاص کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریمِ آدمیت اور شرف انسانیت کا بنیادی منشور ہے۔ آپ نے فرمایا:

> عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

''ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا'' یہ ہے قرآنِ کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسان کو اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔'' یہ ہے وہ بنیاد جس پر قرآنی نظام کی فلک بوس عمارت استوار ہوتی ہے۔

اقلیتوں کے حقوق:

اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت کی ایک مثال تو آپ نے سُن لی۔ اس کے بعد ایک مثال اور بھی سن لیجئے کہ جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں مل سکے گی۔ ایک دفعہ حمصؔ کے حاکم حضرت عمرؓ بن سعد کے منہ سے ایک ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ''اَخزَاکَ اللّٰہ'' خدا تمہیں رسوا کرے'' ___ یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے لیکن اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہہ کہ استعفےٰ پیش کر دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ یہی کہتے ہے کہ جو شخص کسی انسان کی تذلیل کرتا ہے وہ کسی ذمہ دار منصب کے اہل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

قابلِ اعتماد گواہ:

غور فرمایا آپ نے کہ نظامِ خداوندی میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اگلے باب کے لئے ورق الٹیں۔ عدل کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی بصیرت کی ایک مثال بھی سُن لیجئے۔ عدالت میں صحیح فیصلہ کرنے کے لئے قابلِ اعتماد گواہ کی ضرورت لاینفک ہے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لائے جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ:

کیا: تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے ____ اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو ____ اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ ''نہیں'' تو آپ نے فرمایا:

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اُٹھاتے دیکھ لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کسی کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کے لئے کیا معیار بتایا گیا ہے؟

اور آخر میں چلتے چلتے ایک غیر محسوس سا لیکن بڑا حسین (مونالیزا) جیسا تبسم۔ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ:

ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے معاف فرمایئے۔ مجھے اپنا دوست نہ بنایئے۔ دور دور ہی رہنے دیجئے۔

(جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام کے ہر رکن پر عمل کرنے سے دنیا میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہوتا ہے

ارشادِ حضرت باری تعالیٰ ہے: وَلَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا (4:141) یہ ہو نہیں سکتا کہ دنیا میں غیر مسلم، کافر، مومنوں پر غالب آ جائیں۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ساری دنیا کی نگرانی کرنا ہے (2:143)۔ ساری انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں خوف و حزن کی کوئی چیز نہ ہو۔ اس میں مکمل امن و سلامتی ہوتی ہے اور اس میں ایک ایک فرد کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدا ہوجاتی ہیں (62:2، 3:164) اس میں رزق کی فراوانی ہے (6:151؛16:6) قرآن کا وعدہ ہے کہ قرآن کا نظام غالب آ کر رہے گا (9:33، 48:28، 61:9) یہ نظام صرف ایمان اور اعمال صالح کے نتیجہ سے قائم ہوتا ہے اس میں تلوار کا کوئی Role نہیں ہوتا اب آپ خود اپنے آپ کو پرکھ کر دیکھ لیں کہ آپ کس مقام پر کھڑے ہیں اور کس زمرہ میں شامل ہیں۔ جہاد پر عمل کرنے سے غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ قوت، اکٹھی کرو تا کہ اس سے تم اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤ۔ روزہ و حج کی غرض و غایت لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰٮکُمۡ ط (2:185، 22:37)، تا کہ تم اللہ کے قانون کو غالب کر سکو اس بات کے عوض کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی۔ اسلام کا سب سے اہم رکن صلوٰۃ ہے اس کے متعلق ارشاد ہے: اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ط (22:41) ترجمہ: وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو ملک میں اقتدار دیں تو وہ صلوٰۃ قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ معروف کا حکم دیں، اور منکر سے روکیں۔ اس آیت میں قرآنِ کریم نے صلوٰۃ کے لئے اقتدار، یعنی تمکن فی الارض کو شرط قرار دیا ہے۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے اقتدار کی اس شرط کے بارے میں تحریر کیا ہے ''آج مسلمان کمزور اور کافر غالب و قوی نظر آ رہا ہے ہیں۔ لیکن اللہ

> اس آیہ کریمہ (22:41) میں خوب واضح کر دیا گیا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کی پہلی شرط اقتدار ہے اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل ہے تو وہ صلوٰۃ قائم کر سکتی ہے اور اگر کسی قوم کو اقتدار ہی حاصل نہیں ہے تو وہ صلوٰۃ قائم نہیں کر سکتی کیونکہ مسلمان ہمیشہ مغلوب نہیں رہ سکتا۔

تعالیٰ کے قبضہ میں ہے کہ آخر کار انہیں منصور و غالب کردے۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ اُمت خدا کا دین قائم کرے گی ایک مدت تک آخر اللہ ہی جانے کیا ہوگا۔ آپ غور فرمائیں کہ حضرت مولانا نے کس طرح ایک تلخ حقیقت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ صحیح بات یہ تھی کہ حضرت اس بات کا اعتراف فرماتے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور ان کا زوال، ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ایک شیشہ ہے جب چاہیں مسلمان اس میں دیکھ کر اپنا صحیح مقام متعین کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ہمارے علماء و مفسرین میں جرأت و ہمت نہیں اور انہوں نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں مولانا امین احمد اصلاحی صاحب نے اپنی معروف اور بہت عمدہ تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اقتدار کی شرط کی حقیقت کو اس طرح چھپانے کی کوشش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ''الارض سے مراد جس طرح سورہ رعد (41) اور سورہ انبیاء (44) میں ارض مکہ ہے اسی طرح قرینہ دلیل ہے کہ یہاں بھی اس سے مراد ارض مکہ ہے اس لئے کہ یہاں جس جہاد کی اجازت دی گئی ہے اصلاً اس کا تعلق ارض حرم کی آزادی و تطہیر سے ہے۔ فرمایا کہ اس کے موجودہ غاصب اجارہ داروں نے تو اس حرم کے وہ تمام مقاصد برباد کردیئے ہیں جس کے لئے حضرت ابراہیم نے یہاں اپنی ذرّیت کو بسایا تھا۔ البتہ اگر ہم اپنے ان بندوں کو اس سرزمین میں، اپنی تائید و نصرت سے، اقتدار بخشیں گے تو یہ اس کے تمام مقاصد کو از سر نو بروئے کار لائیں گے۔ یہ نماز کا اہتمام کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

(تدبر قرآن، جلد:5، صفحہ:258)

مفتی اعظم پاکستان، مولانا محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں تحریر کیا ہے پس مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ کوئی کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ انجام بھی ان کا یہی رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ اس کے عکس ہوجائے۔

(معارف القرآن، جلد:6، صفحہ:269)

اس آیۂ کریمہ (22:41) میں خوب واضح کردیا گیا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کی پہلی شرط اقتدار ہے اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل ہے تو وہ صلوٰۃ قائم کرسکتی ہے اور اگر کسی قوم کو اقتدار ہی حاصل نہیں ہے تو وہ صلوٰۃ قائم نہیں کرسکتی کیونکہ مسلمان ہمیشہ مغلوب نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کے مسلمان جو نماز ادا کر رہے ہیں وہ اس شرط کو پورا نہیں کرتے، وہ قرآنِ کریم کی رُو سے صلوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ صلوٰۃ صرف اسلامی نظام کے اندر قائم ہوسکتی ہے۔ (اگرچہ جب قرآنی نظام کا قیام نہیں ہوجاتا نماز پنجگانہ ادا کرتے رہیں جس نے جس طرح بھی سیکھی ہے، میں خود بھی باقاعدگی کے ساتھ ادا کرتا ہوں۔) کیونکہ قرآن کے نزدیک غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123)، ہم اپنی تائید میں جلالین سے ایک اقتباس پیشِ خدمت عالی کرتے ہیں، آپ اس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ (عربی سے ترجمہ)

یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم دنیا میں حکومت دے دیں دشمنوں کے مقابل میں ان کی مدد کر کے، تو یہ لوگ نماز کی پابندی

کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کام کا حکم کریں اور بُرے کام سے منع کریں (آنْ مکنّا میں جو شرط تھا) اقاموالصلوٰۃ اوراس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے نیز شرط وجواب الشرط دونوں صلہ ہیں الذین موصول کے، اس سے قبل ایک متبدا ہے محذوف ہے یعنی ہم) اقتباس ختم ہوا۔ یعنی اگرالشرط، یعنی اقتدار حاصل ہواتو جوجواب الشرط یعنی اقامت صلوٰۃ ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر اقتدار حاصل نہیں ہوا تو اقامت صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔ ایک مغلوب ومحکوم قوم اقامتِ صلوٰۃ نہیں کرسکتی۔ اس کے لئے اسلامی نظام کا قائم ہونا شرط ہے جلالین نے اس آیت کی بالکل درست تفسیر کی ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ:

1۔ نماز انفرادی یا گروہی طور پر بھی پڑھی جاسکتی ہے اور صلوٰۃ اجتماعی طور پر قائم Establish کی جاتی ہے۔

2۔ اقامتِ صلوٰۃ سے پُرامن معاشرہ قائم ہوتا ہے اور اس معاشرہ میں کوئی خوف وحزن نہیں رہتا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:277)، ترجمہ: جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے ان کے لئے ان کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس اوران کو نہ خوف ہے اور نہ غم۔ (ترجمہ: حضرت شیخ الہند)

3۔ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (22:78) ترجمہ: سوصلوٰۃ قائم رکھو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو وہ تمہارا مالک ہے اور خوب مددگار ہے۔

اس سے پیشتر کئی مرتبہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ فرائضِ خداوندی کا اتباع ہے۔ خدااورصرف خدا تمہارا حاکم اور کارساز ہے۔ تمہارا کوئی دوسرا حاکم یا نظام نہیں ہے۔ تمہارا نظام جس میں تم زندگی بسر کرسکو صرف اسلامی نظام ہے۔

4۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (24:55-56) ترجمہ: اور جمادے گا ان کے لئے ان کا دین جو پسند کردیا ان کے واسطے اوران کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن دے گا، میری بندگی (محکومی) کریں گے۔ میرے سوا کسی کو شریک نہیں کریں گے اور صلوٰۃ قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، رسول کی اطاعت کروتا کہ تم پر رحم ہو اس آیۂ کریمہ میں خوف واضح کردیا کہ اقامتِ صلوٰۃ تمکن فی الارض کے بعد ہی ہوسکتی ہے لہٰذا ہر وہ مسلمان جو اقامتِ صلوٰۃ اور اقامتِ دین ایک ہی چیز ہے۔ میرا ایک مضمون اس موضوع پر میری کتاب ''اقامتِ دین فرض ہے'' کے صفحہ 124 پر طبع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔

یہاں مضمون ختم ہوگیا صرف قارئین کرام کے ازدیادِ علم کی خاطر تحریر ہے کہ آپ Google پر جاکر Majoos Worship تحریر کریں اور پھر Click کردیں۔ اس پر آپ کو بڑی تعجب انگیز معلومات حاصل ہوں گی۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

دو قومی نظریہ پاکستان والی
اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر: 3

حیوان کی احساسی جبلی زندگی سے علم و آزادیِ ارادہ کی پیکرِ انسانی ذات میں ارتقاء

یونان کے سوفسطائی کے علم کی فردکی سوچ کی حیثیت:

عصرِ حاضر میں کانٹ عقل کی یہ تعریف کرتا ہے کہ عقل ایک فعال اصول ہے، جو اِنسانی تجربی حدود سے بالاتر ہو کر حقیقت سے اِس کی کلیت میں معاملہ بندی کرنا چاہتا ہے اور وہ فہم کے دائرہ کار کی حد بندی بھی کرتا ہے۔ اِس کے برعکس سقراط کے زمانے میں فکری محاذ پر سوفطائی چھائے ہوئے تھے اوران کے مشہور فلسفی پروٹاغورس کے کُلی کی جگہ اُس کے موَقف کے بارے میں زبان زدعوام موضوعی مقولہ کا چرچا تھا۔

''آدمی ہر شے کا پیمانہ ہے۔ جو ہیں اور وہ جو نہیں ہیں کہ وہ نہیں ہیں۔''

اس کا مطلب یہ بتایا جاتا تھا کہ ہر شخص بطور فرد اپنے ذہن کے مرتب کردہ معیار میں اپنی پہچان رکھتا ہے، اور جب دو آدمیوں میں سے کسی کے بارے یا مسئلے میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو سچ یا صداقت کوئی معروضی کُلی ایسی نہیں جس پر پرکھ کر ایک کو درست اور دوسرے کو غلط قرار دیا جا سکے۔ سوفسطائی حکیم گورجیاس کہا کرتا تھا کہ

> کوئی خیال بغیر لفظ کے ذہن میں نہیں آ سکتا اور کوئی لفظ آپ کے ذہن میں نہیں آ سکتا، جس کا ایک تصور یعنی معانی آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ بامعنی لفظ وہ ہوتا ہے، جس کا معنی یا مفہوم، ایک تصور کی شکل میں، آپ کے ذہن میں آ جائے۔ آپ کو کوئی ایسا خیال یا تصور نہیں آ سکتا، جس کے لیے آپ کے ہاں پہلے سے لفظ موجود نہ ہوں۔ اِسی لئے نئے تصورات کی ادائیگی کے لئے نئے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں۔

1۔ پہلی بات یہ کہ دنیا میں کسی چیز کا وجود نہیں۔

2۔ دوسری یہ کہ اگر کوئی چیز واقعتاً وجود رکھتی ہے تو اس کی حقیقت کا ادراک ممکن نہیں۔

3۔ تیسری یہ کہ اگر حقیقت کا ادراک بھی ہو جائے، تو اس کا ابلاغ ممکن نہیں ہوتا۔

پروٹاگورس نے ''آدمی'' کی اصطلاح تصور کلیہ کے طور پر استعمال نہیں کی بلکہ ''آدمی'' سے مراد ہر منفرد آدمی ہی ہے۔ انہوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ دو آدمیوں کی گفتگو میں کچھ خیالات مشترک بھی ہو سکتے ہیں۔ اِس لئے وہ آدمی کی اپنی ہی رائے کو کُلی حیثیت دیتے تھے۔

سقراط نے اس کے برعکس یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آدمی کی بطور فرد ایک رائے ہو سکتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ سبھی افراد کی نمائندگی بھی کرتے ہوں۔ اُن کا موقف تھا کہ ہم تو روزمرہ کی زندگی میں صرف مخصوص یا منفرد انسانوں سے ملتے ہیں۔ لیکن گفتگو میں ہم وہ الفاظ (یعنی تعقلات یا تصورات کلیہ) استعمال کرتے ہیں جو کسی بھی ایسی مخصوص و منفرد شے کی طرف اشارہ نہیں کرتے، جو زمان و مکان کی قیود میں ہوں اور جن کا ہم تجربہ اپنے حواس سے کر سکیں۔ اِجتماعی طور پر آدمیوں کی جماعت میں گفتگو میں کچھ خیالات اور نظریات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن پر کامل اتفاق ہو۔ اگر ابتداء میں یہ اشتراک ابھی خیال میں نہ آیا ہو، پھر بھی سقراط کا مؤقف ہے کہ استدلال یعنی عقل کے استعمال سے اسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

سقراط کا اِنسان کو بطورِ حیوانِ عاقل تصور دینے کا موقف:

سقراط کا مؤقف ہے کہ کسی چیز یا عمل کی تعریف کرنے میں اگر کوئی مخصوص صِفت یکساں اور لازمی طور پر ہمیشہ کے لئے پائی جانے، تو وہ میز یا عمل اُسی مخصوص صِفت کے نام سے اپنی پہچان رکھتی ہے۔ عام زندگی میں عقلِ انسانی بھی کسی شے کے تصورات/تعقلات کو اسی طرح وضع کرتی ہے۔ اِس لئے جب ہم انسان کا تعقل یا تصور وضع کرتے ہیں تو لفظ ''انسان'' کی تعریف میں صرف وہی صفات شامل کرتے ہیں جو تمام انسانوں میں یکساں طور پر اور لازماً پائی جائیں۔ انسان کی تعریف میں ہم سبھی میں شامل نہ ہونے والی دو ٹانگوں والا ہونا'' یا'' لمبے قد والا ہونے والی صِفات شامل نہیں کر سکتے۔ دو ٹانگوں والا ہونا یا لمبا ہونا وہ صفات نہیں ہیں جو تمام بنی نوع انسان میں یکساں طور پر اور لازماً پائی جائیں۔ اس کے برعکس اگر ''انسان'' کی تعریف میں ہم حیوان ہونا اور عاقل ہونا شامل کریں تو یہی دو صفات ایسی ہیں جو تمام انسانوں میں بلا امتیاز رنگ و نسل یکساں طور پر اور لازماً پائی جاتی ہیں۔

اس فلسفیانہ تفکر کا طریق کار سقراط نے مکالماتی انداز سے حاصل کیا۔ اس مکالماتی طریق کار سے اسے چند ایسی مشترک اور لازمی مثالیں ضرور مل جاتی ہیں، جن کی بنیاد پر سقراط تعقل وضع کرتا ہے۔ اس تعریف کی صحت کو وہ مزید مثالوں کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اگر مزید مثالوں سے کسی شے یا عمل کی تشریح اس کے متعلقہ تعقل یا تصور کلی کے حوالے سے ہو جائے تو سقراط کے بقول ہمیں اس کی حقیقت کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ کسی بھی زید یا بکر کی طرف اشارہ کیا جائے کہ ''وہ انسان ہے'' تو ہمارا اشارہ کسی مخصوص اور منفرد آدمی کی طرف ہوگا۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ''انسان فانی ہے'' تو ہمارا اشارہ کسی مخصوص فرد

کی طرف نہیں ہوتا بلکہ ہمارا اشارہ ان یکساں اور لازم صِفات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو تمام آدمیوں پر حاوی ہوتی ہیں۔

اب انسان کی تعریف یا تعقل متعین کرنے کے بعد ہم اس کا اطلاق کسی شے یا فرد پر کر کے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ انسان ہے یا نہیں۔ اگر کوئی فرد حیوانیت کی صفات کے حامل ہونے کے ساتھ عقل بھی استعمال کرتا ہے تو وہ دونوں لازمی خصوصیات کے بل بوتے پر انسان کہلانے کا حقدار ہے۔ اس کے برعکس صِرف حیوانیت کی صِفت رکھتے ہوئے وہ اِس کے ساتھ دوسری لازم اور مشترک صفت عقل سے کام نہیں لیتا تو وہ ''انسان'' کے تعقل میں شامل ہونے کے اہل نہیں رہتا۔ اسے حیوان ہی کی ایک چار پایوں کی ترقی یافتہ شکل میں شمار کیا جائے گا، بلکہ قرآن کی رو سے صلاحیت رکھنے کے باوجود اُس سے کام نہ لینے کی بنا پر جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جائے گا۔

ارسطو کہتا ہے کہ ہر اچھی تعریف کے دو اجزاء ہوتے ہیں۔ ہر تعریف اِن دو ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ پہلے تو تعریف کے ذریعہ سے زیر بحث شئے کو ایک جماعت یا جنس کے اندر داخل کر لیا جاتا ہے، جس کے عمومی خصائص اس شے میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یوں انسان کی تعریف میں ہم دیکھتے ہیں کہ بدرجہ جنس حیوانی صِفات کا حامل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بات کی توضیح کی جاتی ہے کہ زیر بحث شے اس قسم کی دوسری جنس میں شمار ہونے والی اشیاء سے کس طرح مختلف ہے۔ چنانچہ انسان، ارسطو نے عاقل حیوان میں اِس کے صاحب وقوف و عقل سے واضح کیا ہے کہ عقل ہی انسان کو حیوان سے جدا کر کے ایک ممتاز اور منفرد مقام دلاتی ہے۔ ارسطو کے مطابق عقل سے مراد یہاں عقل کا ودیعت ہونا نہیں، بلکہ عقل کی صلاحیت سے کام لینا ہے۔ ارسطو نے یہاں عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1۔ عقل انفعال یعنی ودیعت کردہ بالقوہ عقل۔

2۔ عقل فعال یعنی ودیعت کردہ بالفعل عقل۔

1۔ عقلِ انفعال:۔ اِس سے ارسطو کی مراد وہ ذہنی استعداد ہے جس سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ تفکر سے تفکر کرنے کی جو قابلیت بالقوت ذہن میں موجود ہوتی ہے۔ اس کو ارسطو عقلِ انفعال کہتا ہے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے اور اِس کا اِنسان کے اپنے کسب سے تعلق نہیں ہوتا۔

2۔ عقلِ فعال ودیعت کردہ عقل کے خود تفکر کے کسب کا عمل ہے جس کی کرّہ ارض پر صرف انسان کو استعداد حاصل ہے۔ اِسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب انسان عقل بالقوت سے انتخاب کرتا ہے تو اسی انتخاب کی بدولت اس کا حیوان سے انسان کی سمت ارتقاء ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ عقل فعال (جو اسے حیوان سے علیحدہ کرتی ہے) سے کام نہیں لیتا تو وہ منطق کی رو سے حیوان کے درجے میں ہی رہتا ہے اور اس طرح ارتقاء سے محروم رہتا ہے۔ عام طور پر انسان بلوغت سے قبل اپنی زندگی میں طویل عرصے تک اس حالت کی حدود و قیود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمام انسانوں کو اس علم سے نکل کر تعقل کی شکل میں ایک اعلیٰ وارفع درجے کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت بھی عطا کی گئی ہے لیکن اس بات کا احساس بھی

بہت کم لوگوں کو ہو پاتا ہے اور ہو بھی تو اس کی اثر انگیزی بہت محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت پہلی حیوانی قسم کے سطحی علم پر ہی مطمئن دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے قرآن نے عقل سے کام نہ لینے والے انسانوں کی اکثریّت کو حیوانی مقام بلکہ اُس سے بھی بدتر راہ گُم کردہ جاہلیت پر ہونے کی نشاندہی کی ہے۔

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَکۡثَرَهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ یَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا (25:44)

(اے رسول!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر تیری طرف سے پیش کردہ دلائل و براہین پر کان دھرتے ہیں، اور عقل وخرد سے کام لیتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ یہ تو بس حیوانوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اس امر کی مزید مزید وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ (8:22)

قانون خداوندی کی رو سے، بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں، جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں، اور عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

انسان میں علم کی صلاحیت ودیعت کئے جانے کا قرآنی موقف انسان میں اللہ کی طرف سے عقلی علم کی صلاحیت ودیعت کئے جانے کا قرآنی موقف درجِ ذیل آیت کی روشنی میں اِنسانی بچہ کی ارتقائی توازن بخش صورت اختیار کرنے کے ضمن میں بیان کیا جارہا ہے۔

> ہمارا جاننا لازم ہے کہ خیال اور لفظ میں معنوی تعلق کیا ہے اور معنی کہاں ہوتے ہیں؟ یہ بڑا مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔ الفاظ کا تجزیہ کیجیے تو وہ چند حروف ہی ہوتے ہیں۔ حروف کو الگ الگ کر دیجیے تو معانی کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن حروف کے مجموعے پر مشتمل جو لفظ ہے، وہ آپ کو اپنے متعین معانی دیتا ہے۔ ایسے متعیّن معنی کہ جب ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ''پانی پینا ہے'' تو وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے آتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سننے والا پانی کی جگہ کوئی اور چیز اٹھا لایا ہو۔ الفاظ ''پانی پینا ہے'' میں مادی پانی کہاں سے آ گیا؟ موجود ہوتا ہے لیکن ہم بتا نہیں سکتے کہ وہ کیسے موجود ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ (9:32)

اُس نے اِنسان کو توازن بخش ہیت عطا کی اور پھر اِنسانی ذات میں الٰہیاتی توانائی پھونکی جس سے اُس میں سمع، بصر اور فوأد کی صلاحتیں وجود میں لائی گئیں۔

اِس حوالہ سے ہمارے زمانے میں زبانوں کے عِلم کا علم المعانی دریافت ہوا ہے۔ اس شعبے کے محققین، اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کو بیان کرنے کے لئے، الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں۔ محض چند الفاظ ادا کرنے سے سارا تصور ذہن میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح الفاظ ہمارے ذہن میں اِس وقت تک نہیں آسکتے، جب تک الفاظ کے

لئے، ہمارے ذہن میں پہلے سے کوئی تصور موجود نہ ہو۔کوئی خیال بغیر لفظ کے ذہن میں نہیں آ سکتا اور کوئی لفظ آپ کے ذہن میں نہیں آ سکتا، جس کا ایک تصور یعنی معانی آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ بامعنی لفظ وہ ہوتا ہے، جس کا معنی یا مفہوم، ایک تصور کی شکل میں، آپ کے ذہن میں آ جائے۔آپ کو کوئی ایسا خیال یا تصور نہیں آ سکتا، جس کے لیے آپ کے ہاں پہلے سے لفظ موجود نہ ہوں۔اِسی لئے نئے تصورات کی ادائیگی کے لئے نئے الفاظ وضع کیے جاتے ہیں۔

ہمارا جاننا لازم ہے کہ خیال اور لفظ میں معنوی تعلق کیا ہے اور معنی کہاں ہوتے ہیں؟ یہ بڑا مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔ الفاظ کا تجزیہ کیجیے تو وہ چند حروف ہی ہوتے ہیں۔حروف کو الگ الگ کر دیجیے تو معانی کہیں نظر نہیں آئیں گے۔لیکن حروف کے مجموعے پر مشتمل جو لفظ ہے، وہ آپ کو اپنے متعین معانی دیتا ہے۔ایسے متعیّن معنی کہ جب ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ''پانی پینا ہے'' تو وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے آتا ہے۔کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سننے والا پانی کی جگہ کوئی اور چیز اٹھالایا ہو۔الفاظ ''پانی پینا ہے'' میں مادی پانی کہاں سے آ گیا؟ موجود ہوتا ہے لیکن ہم بتا نہیں سکتے کہ وہ کیسے موجود ہے۔ جب ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ''ساتھ والے کمرے میں، صاف وشفاف پانی سے بھرا ہوا گلاس میز پر رکھا ہوا ہے'' تو بغیر ساتھ والے کمرے میں گئے، ساتھ والا کمرہ، کثافتوں سے پاک، پانی سے بھرا ہوا گلاس، میز پر رکھا ہوا ہمارے تصور میں آ جاتا ہے، حالانکہ نہ تو ہم ساتھ والے کمرے میں گئے ہوتے ہیں، نہ ہی ہم نے ساتھ والے کمرے میں پانی سے بھرا ہوا گلاس میز پر رکھا ہوا دیکھا ہوتا ہے۔آپ غور کریں محض الفاظ ''ساتھ والے کمرے میں، صاف وشفاف پانی سے بھرا ہوا گلاس میز پر رکھا ہوا ہے''، میں نہ تو مادی ''ساتھ والا کمرہ'' موجود ہے، نہ ''پانی'' موجود ہے، نہ ''گلاس'' موجود ہے، اور نہ ''میز'' موجود ہے یعنی فقرہ ''ساتھ والے کمرے میں، میز پر صاف وشفاف پانی سے بھرا ہوا گلاس رکھا ہوا ہے'' لیکن اِن میں یہ سبھی مادی اشیاء موجود نہیں، لیکن پھر بھی یہ مادی اشیاء ہمارے تصور میں آ جاتی ہیں۔

یہاں ہمیں معلوم ہونا چاہئیے کہ علم کا پہلا درجہ مواد کی شکل میں حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔جس میں سمع و بصر زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور اس سے آگے فواد یعنی ذہن میں علم کا درجہ ہے، جس میں مدرکات سے تصورات متعین کئے جاتے ہیں۔سمع و بصر انسانی حواس کے ایسے نمائندے ہیں جو خارجی دنیا کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ معلومات انسانی قلب یا فواد کے ذریعہ سے پہنچتی ہیں اور اس سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے کچھ فیصلہ کرے۔ یہ سب سے بڑا امتیاز کہلاتا ہے جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے۔

یہ حصہ حیوانی نہیں بلکہ انسانی سطح کی زندگی میں حاصل ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ جہاں تک تصورات اور اسماء کا تعلق ہے تو کوئی ایسا تصور ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک اس کے لیے لفظ (اسم) موجود نہ ہو اور کوئی لفظ بغیر تصور کے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس سورہ البقرا کی اِس آیت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ آدم نے چیزوں کی کیفیّت، ماہیّت اور خصوصیات جان لیں، کہ وہ کس قانون کے تحت کام کرتی ہیں۔اِس طرح وہ کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھنے کے قابل ہو گیا۔عِلم ہی

کے ضمن میں، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں اِنسان کی مزید صلاحتیں بیان کی گئی ہیں کہ:

1۔عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55:4)　　اسے بولنا سکھایا۔

یعنی انسان کو قوتِ گویائی عطا کی ہے تاکہ وہ اپنے علم کو بیان کر سکے۔ دراصل بولنے اور تحریر کرنے کی صلاحیتیں، انسان کی ذات میں خوابیدہ شکل میں موجود تھیں۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذات کے ملنے کے فوراً بعد انسان فرفر بولنے کے قابل ہو۔ انسان کی یہ خوابیدہ صلاحیتیں آہستہ آہستہ پروان چڑھیں، تو ایک عرصہ یا دور گزرنے کے بعد، انسان بولنے اور تحریر کرنے کے قابل ہوا۔

2۔الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (96:4)

''جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا''۔

یعنی انسان کو تحریر کی صلاحیت دی۔

3۔عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (96:5)

''انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

یعنی انسان میں حصول علم کی استعداد وویعت کر دی۔ انسان میں یہ صلاحتیں پہلے سے مضمر طور پر رکھ دی گئی ہیں، جنہیں وہ اپنی محنت اور کاوش سے بروئے کار لاتا ہے۔

یعنی یہ نہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ عالم فاضل و فاضل اور صاحبِ قلم ولسان ہوتا ہے۔ وہ تو بالکل کورا ہوتا ہے، البتہ اس میں ایسا بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے جس کے لیے محنت اور کاوش درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا حیوان سے انسان کا ارتقاء عقل کی صلاحیت کے استعمال کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ علم، وجہءِ شرف انسانیت ہے۔ کسی ایک دور میں، بڑے سے بڑا سائنس دان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کائنات کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں، ابھی انسان کا علم بہت کم ہے۔ کُلَّھا کہہ کر بتارہا ہے کہ انسان نے ایک دور میں طبیعی قوانین کی رو سے زندگی بسر کرنے والی اشیاء کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لینا ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ آدم کے لیے، تو ابھی بڑے وسیع میدان آنے والے ہیں ۔جب تک انسان یہ کُلَّھا کا مقام حاصل نہیں کر لے گا سلسلہءآدم کا مقام ختم نہیں ہوگا۔

بڑے سے بڑا سائنس دان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کائنات کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں، ابھی انسان کا علم بہت کم ہے۔ کُلَّھا کہہ کر بتارہا ہے کہ انسان نے ایک دور میں طبیعی قوانین کی رو سے زندگی بسر کرنے والی اشیاء کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لینا ہے۔ نظر آ رہا ہے کہ آدم کے لیے، تو ابھی بڑے وسیع میدان آنے والے ہیں جب تک انسان یہ کُلَّھا کا مقام حاصل نہیں کر لے گا سلسلہءآدم کا مقام ختم نہیں ہوگا۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں علم درجِ ذیل دو معانی پر مشتمل ہوتا ہے۔

1۔ایک تو یہ ہے کہ فلاں شے کیا ہے؟

2۔اور دوسری بات یہ کہ یہ شے کس قانون کے تابع کام کر رہی ہے؟

جوں جوں انسان اشیاء کے قانون کو دریافت کرتا چلا جائے گا، ہر مادی قوّت اس کے سامنے مسخر ہوتی چلی جائے گی، یہ تمام اشیاء انسان کے سامنے جھکتی چلی جائیں گیں۔ یہ مقام آدم ہے کہ تسخیر کائنات کے ذریعے سامان نشو ونما حاصل کرے۔ لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ:

ہر آدم مومن نہیں ہوتا، لیکن ہر مومن آدم ہوتا ہے، بلکہ وہ پہلے آدم ہوتا ہے، اس کے بعد مومن بنتا ہے۔ اِس لئے کہ مقامِ آدم تو یہ ہے کہ تسخیر کائنات کرے، اور مقام مومن یہ ہے کہ تسخیر کائنات کے ماحاصل کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرے۔ لیکن جو قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے عِلم ہی حاصل نہیں کرتا وہ مقامِ مومن تو ایک طرف مقامِ آدم بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جسے مقام آدم ہی نصیب نہیں ہوا، وہ مقام مومن تک پہنچنے کی اہلیت رکھنے کے بجائے حیوانی مقام میں گر جاتا ہے۔

ہر آدم مومن نہیں ہوتا، لیکن ہر مومن آدم ہوتا ہے، بلکہ وہ پہلے آدم ہوتا ہے، اس کے بعد مومن بنتا ہے۔ اِس لئے کہ مقامِ آدم تو یہ ہے کہ تسخیر کائنات کرے، اور مقام مومن یہ ہے کہ تسخیر کائنات کے ماحاصل کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرے۔ لیکن جو قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے عِلم ہی حاصل نہیں کرتا وہ مقامِ مومن تو ایک طرف مقامِ آدم بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جسے مقام آدم ہی نصیب نہیں ہوا، وہ مقام مومن تک پہنچنے کی اہلیت رکھنے کے بجائے حیوانی مقام میں گر جاتا ہے۔

قرآن نے اِنسان کا جبلتوں اور عقل پر مبنی جذبات سے قابو نہ پانے کے نتیجہ میں ہیجانی کیفیات سے دوچار ہوتے ہوئے زندگی گزارنے کی حالت کو الھوٰی کی اصطلاح سے متعارف کرایا ہے۔ قرآن میں اِس کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔

قرآن میں اِنسان کا جبلتوں پر قابو نہ رکھنے کی وجہ سے حیوان سے بھی کم مقام میں گر جانا:

قرآن نے اِنسان کا عقل رکھنے کے باوجود اُس سے کام نہ لیتے ہوئے جبلتوں کو عقل سے قابو پانے میں ناکام رہنے کو سورہ الحج میں یہ بات زیادہ واضح کر دی ہے کہ وہ طبعی طور پر تو عقل بالقوہ کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے کام نہ لینے کی قوت بالفعل کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے عاقل حیوان کے اِنسانی مقام ابھی تک حاصل نہیں کر سکے۔

اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا (25:44)

(اے رسول!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر تیری طرف سے پیش کردہ دلائل و براہین پر کان دھرتے ہیں، اور عقل وخرد سے کام لیتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ یہ تو بس حیوانوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ہیں۔

اِن آیات کی روشنی میں ہمیں یہ نظر آ رہا ہے کہ حیوان اور انسان دونوں میں یہ طبعی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حیوان، ان جبلتوں پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا جبکہ انسان کو یہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ علم کی صلاحیت کی مدد سے اپنے اختیار کے ساتھ ان میں انتخاب کر سکتا ہے۔

یہاں قرآن انسان کی اس حالت کا پیش کر رہا ہے۔ جب وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوئے حیوانوں کی مانند اپنی جبلتوں کے احساس سے مشتعل ہو کر ہیجانی زندگی گزارتا ہے۔ یہاں الانسان کی ہیجانی کیفیت بیان کی گئی ہے، جس میں نہ تو وہ عقل سے کام لیتا ہے اور نہ ہی اپنی آزادیِ اِرادہ سے اپنے جذبات پر کنٹرول قائم کرتا ہے۔ اِیسی حالت میں قرآن اللہ کے رسول سے یہ کہتا ہے کہ:

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ (22:46)

''کیا یہ لوگ ان علاقوں میں چلے پھرے نہیں کہ (ان سابقہ اقوام کے عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر) ان کے دلوں میں عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کے کانوں میں بات سننے کی استطاعت پیدا ہو جاتی! (اصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو) یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، (وہ تو بدستور بینا ہوتی ہیں لیکن) ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں (اور اس طرح ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہیں''۔

ہم عاقل اِنسان کے نظریہ سے آگاہی کے بعد یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ انسان ایک حیوان بھی ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ انسان صرف حیوان ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف حیوان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان تمام خصائص کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو صرف انسان کے ساتھ خاص ہیں اور باقی حیوانات میں سے کسی میں وہ موجود نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں ہوتا ہے۔ فطرت میں انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین انسانی ذات میں حیوانی جبلتوں اور انسانی جذبات کے رویوں کا فرق یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:

1۔ حیوان صرف جانتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ انسان جب سوچتا، جانتا اور محسوس کرتا ہے تو وہ یہ جانتا بھی ہے کہ وہ سوچتا ہے، جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ گویا حیوان کا شعور اپنے آپ سے آگاہ نہیں، لیکن انسان کا شعور اپنے آپ سے آگاہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس حقیقت کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں۔ کہ حیوان فقط شعور کا مالک ہے لیکن انسان خود شعوری

سے بہرہ ور ہے۔

2۔حیوان اپنی جبلتوں کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ان کے طبیعی مطالبہ کو روک نہیں سکتا۔اورانہیں اپنے اختیاروارادہ سے تشنہ یا غیر مطمئن نہیں رکھ سکتا۔انسان اپنی جبلتوں کی مخالفت کرسکتا ہے۔ان کے طبیعی مطالبہ کو روک سکتا ہے اور اپنے اختیاروارادہ سے ان کو تشنہ اور غیر مطمئن رکھ سکتا ہے۔

3۔حیوان اپنی کسی جبلت کو اس کے طبعی مطالبہ سے زیادہ مطمئن نہیں کرتا۔انسان اپنی جبلتوں کو ان کی ضروریات اور طبعی حدود سے زیادہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

4۔حیوان جبلتوں کی لذت کے لیے اتنی ہی کشش رکھتا ہے جتنی کہ ان کی طبیعی فعلیت (Natural activity) کے ساتھ وابستہ کی گئی ہے لیکن انسان کی یہ کشش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

5۔انسان محض آدرشوں (Ideas) کی خاطر یعنی ان کی کشش اور محبت سے مجبور ہوکر آدرشوں کی طلب اور جستجو کرتا ہے اوران کے حصول کے لیے جبلی تقاضوں کو بھی قربان کرتا ہے۔حیوان کے اندر کوئی ایسا جذبہ عمل موجود نہیں ہوتا۔

6۔انسان علم کی خاطر علم کی جستجو کرتا ہے۔انسان کے اندر صداقت یا علم کی تلاش خود صداقت یا علم کی غرض کے علاوہ کسی اورغرض کے لیے نہیں ہوتی۔حیوان کے اندر بے شک ایک ذوقِ دریافت (Curiosity) موجود ہوتا ہے لیکن یہ ذوق اس کی جبلتوں کی خدمت اوراعانت کے لیے اپنی تشفی چاہتا ہے۔

7۔انسان،حیوان کے برعکس اخلاقی اقدار کو ان اقدار ہی کے لیے چاہتا ہے اوران کے حصول کی کوشش میں وہ اس بات کی پروانہیں کرتا کہ اس کے تقاضے ٹھیک طرح سے مطمئن ہوگئے ہیں یا نہیں۔

8۔انسان حسن کو حسن کے لیے آزادانہ طور پر طلب کرتا ہے اوراپنے کاموں میں حسن کا اظہار کرتا ہے جبکہ اِس کے برعکس حیوان ایسا محض جبلت کے طور پر کرسکتا ہے۔

9۔انسان کے عواطف (Emotions) حیوان کے عواطف کی نسبت بہت زیادہ متنوع ہوتے ہیں۔

10۔صوفیاء اورعباد کو ایک ایسا روحانی تجربہ (Mystic Experience) حاصل ہوتا ہے۔جس میں ان کی مسرت یا خوشی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔کسی جبلت کی تشفی اس قسم کی مسرت یا خوشی پیدا نہیں کرتی۔لہٰذا حیوان اس مسرت سے قطعاً بے بہرہ اور بے نصیب ہوتے ہیں۔

11۔ بنیادی طور پر انسان غوروفکر سے اپنے ارادے پر اختیار رکھتے ہوئے اعمال تخلیق کرتا ہے اور ایسے تخلیقی اعمال صِرف انسان سے ہی منسوب ہوتے ہیں۔یہ اُسی کے اپنے انتخاب کا حصہ ہوتے ہیں اور اِسی لئے وہ انہی اعمال کی جزاوسزا کا ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کے برعکس حیوان میں نہ تو غوروفکر کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے اختیار سے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس لیے وہ جبلی تقاضوں سے مجبور محض ہونے کے ناطے سے ذمہ دار نہیں کہلاتا۔

حیوان اور اِنسان کی ذات کے درمیان اِس عقلی علم کی صلاحیت کی بنیاد پر تمیز سے، برگسان کی یہ وضاحت مزید تقویت حاصل کر لیتی ہے کہ حیوان اور انسان میں باہمی فرق نہ تو انسان اور حیوان ہونے کا ہے اور نہ ہی شدت واخوت کا ہے۔ بلکہ اُن دونوں میں نوعی فرق ہے۔ ''یعنی این چیزے دیگر است''۔ یہ دونوں الگ الگ نوع شمار ہوتے ہیں۔

یہ چیزے دیگر کا ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس باب میں ایک بالکل نئی قسم کا ارتقاء بھی نمودار ہو رہا ہے۔ انسانی ذات کا حیوانی جبلتوں کے ساتھ عقل وعِلم اور آزادیِ اِرادہ سے متصِف ہونے کے بعد ظہور ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مادی نظریہ حیات میں انسان کی طبیعی زندگی کو ہی اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے والے انسانی ذات سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کے نظریہ میں انسان کی حیوانی زندگی ہی اِس دنیا میں اُس کی آخری زندگی ہے، جس میں آزادی ارادہ کی نہیں بلکہ نظریہ جبریت کی حکمرانی کے موضوع پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔

انسانی ذات کا حیوانی جبلتوں کے ساتھ عقل وعِلم اور آزادیِ اِرادہ سے متصِف ہونے کے بعد ظہور ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مادی نظریہ حیات میں انسان کی طبیعی زندگی کو ہی اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے والے انسانی ذات سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کے نظریہ میں انسان کی حیوانی زندگی ہی اِس دنیا میں اُس کی آخری زندگی ہے، جس میں آزادی ارادہ کی نہیں بلکہ نظریہ جبریت کی حکمرانی کے موضوع پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔

کُفر کے مادی نظریہ حیات میں اِنسانی ذات کا انکار:

میکانکی نظریہ اور انسانی آزادی دو متضاد تصورات ہیں۔ حکمائے مغرب کے میکانکی تصورِ حیات کی رو سے انسان ایک بے بس مشین بن کر رہ جاتا ہے اس میں اپنا اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں۔

مادی تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے تحت، اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے، اور انہی قوانین کے تحت وہ مر جاتا ہے۔ قرآن کریم، اس تصورِ حیات کے بارے میں کہتا ہے کہ:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (24:45)

''یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم قوانین طبیعی کے مطابق مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور مرورِ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ہوتا، یہ محض ظن وقیاس سے کام لیتے ہیں''۔

قرآن اس زندگی کو حیوانی سطح کی زندگی قرار دیتا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)''

جولوگ بلند سطح زندگی سے انکار کرتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں (اور پھر مر جاتے ہیں)''۔

انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے اور ماہرین علم الابدان ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی جسم لاتعداد خلیات سے مرکب ہے۔ وہ یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ ان خلیات کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ یہ ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح وجود میں آ گئے اور جب تک انسان زندہ رہے گا اسی شکل میں باقی اور موجود رہیں گے ان کا کہنا یہ ہے کہ

1۔ اِن خلیات میں ہر آن تغیر وتبدل کا عمل (Metabolism) جاری رہتا ہے۔

2۔ لاتعداد خلیات ضائع (Catabolisim) ہوتے رہتے ہیں اور

3۔ ان کی جگہ بے شمار نئے خلیات (Anabosm) بنتے رہتے ہیں۔

اس مسلسل تغیر وتبدل کا نتیجہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جسم انسانی (جوان خلیات سے مرکب ہے) ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس (نئے جسم) میں سابقہ جسم کا کچھ حصہ باقی نہیں رہتا۔ پہلے تحقیق یہ کی گئی تھی کہ سابقہ جسم، نئے جسم میں سات سال کے عرصہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تبدیلی تین سال میں عمل میں آ جاتی ہے۔ بہر حال یہ تبدیلی تین سال میں ہو یا سات سال میں، ان کی اس تحقیق میں کوئی اختلاف نہیں کہ کچھ عرصہ بعد انسان کا سابقہ جسم یکسر نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر انسان مادی نظریہ حیات سے عبارت ہو صرف اس کا گوشت پوست جسم سے تو تین یا سات سال بعد پہلا فرد ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ ایک نیا فرد لے گا۔ اس تبدیلی کا عملی دنیا میں کیا اثر ہوگا اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیں۔ دس سال پہلے زید نے آپ سے کچھ روپے بطور قرض لیے اور آپ کو رسید یا تمسک لکھ کر دے دیا۔ اب وہ قرضہ کی واپسی سے انکار کرتا ہے۔ آپ اس کی تحریر عدالت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی مدافعت میں ڈاکٹر کی شہادت پیش کر دیتا ہے کہ جس زید نے دس سال پہلے یہ تحریر لکھی تھی اس کے جسم کا ایک ذرہ بھی اب موجودہ زید کے جسم میں باقی نہیں رہا۔ وہ زید مدت ہوئی فنا ہو گیا۔ اب اس کی جگہ ایک نیا زید وجود میں آ گیا ہے۔ اگر اس (موجودہ) زید سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرضہ کوئی لے اور اس کی ادائیگی کوئی اور کرے اور اگر قرضہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے کچھ سزا دی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ یہ انتہائی ظلم ہوگا۔

اب سوچئے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت ہے تو عملی دنیا میں اس کے کیا نتائج ہوں گے؟ نہ کوئی عہد ومعاہدہ باقی رہے گا نہ قول وقرار، نہ کسی سے ضابطہ اور قانون کی پابندی کرائی جا سکے گی، نہ مواخذہ اور باز پرس ہو سکے گی، نہ کسی کو جرم کا مرتکب قرار دیا جا سکے، نہ سزا کا مستوجب۔ اور تو اور اگر دس سال کے بعد کسی کی بیوی اس سے یہ کہہ دے کہ جس عورت نے تم سے نکاح کا عہد باندھا تھا وہ تو اب ختم ہو چکی ہے میں اس عقد کی پابند نہیں ہوں۔ تو مذکورہ

صدر نظریہ کی رو سے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہوگی ۔اسی حقیقت کے پیش نظر برائٹ مین نے کہا ہے کہ

اخلاقی نظام کا دارومدار اس مسلمہ (اصول) پر ہے کہ میں اپنے تمام گزشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں اس لیے کہ اگر میں کچھ عرصہ کے بعد وہی نہیں رہتا جو مَیں پہلے تھا تو اس صورت میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا ان فیصلوں کی خلاف ورزی اور ان معاہدوں کی شکست کا الزام مجھ پر کیسے عائد ہوسکتا ہے۔

ہمارا اپنا تجربہ، اپنا احساس اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ ''میں'' اس جسم کا نام نہیں جو ہر سات یا تین سال کے بعد بالکل نیا ہوجاتا ہے۔" میں" اس حقیقت ثابتہ کا نام ہے جو جسم کے تغیرات کے علی الرغم ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہے۔تغیرات کے بحر متلاطم میں اس تغیر نا آشنا گہر تابدار کا نام انسانی ذات ہے۔ باردیو کے الفاظ میں

(PERSONALITY IS CHANGLESSNESS IN CHANGE)

انسانی ذات،تغیرات کی دنیا میں ثبات کا نام ہے

ہم جانتے ہیں کہ مادی نظریہ حیات میں انسان کی طبیعی زندگی کو ہی اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے والے انسانی ذات سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کے نظریہ میں انسان کی حیوانی زندگی ہی اِس دنیا میں اُس کی آخری زندگی ہے، جس میں آزادیِ ارادہ کی نہیں بلکہ نظریہ جبریت کی حکمرانی کے موضوع پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ میکانکی نظریہ اور انسانی آزادی دو متضاد تصورات ہیں۔ حکمائے مغرب کے میکانکی تصور حیات کی رو سے انسان ایک بےبس مشین بن کر رہ جاتا ہے اس میں اپنا اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں۔ آج ساری دنیا میں چاہے وہ مسلمان ہوں یا کوئی اور مذہب رکھتے ہوں، وہ اختیار و اِرادہ کی حامل انسانی ذات کا انکار کر رہے ہیں۔

اِس کے برعکس مادی نظریہِ حیات میں انسان کو صاحب اختیار و ارادہ کا حامل ہی نہیں سمجھا جاتا اور نظریہِ جبریت پر یقین کیا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ میکانکی نظریہ حیات کے حکماء مغرب میں ڈیکارٹ اور کانٹ جیسے مُفکر انسان کو اس کے افعال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں یعنی یہ نظری طور پر تو انسان کو مجبور محض (ایک مشین) لیکن عملی طور پر انسان کو صاحب اختیار و ارادہ مانتے ہیں۔ اس لیے کہ کوئی کام چل ہی نہیں سکتا جب تک انسان اپنے افعال کا ذمہ دار قرار نہ پائے۔ یہی " میں" (یا انسانی ذات) ہے جو ایک فرد کے تمام اعمال کی ذمہ دار اور ان کے نتائج و عواقب کی مؤثر ہے۔

مادی نظریہِ حیات میں نظریہِ جبریت کے تحت کہا جاتا ہے کہ اِنسانی اعمال پر مشتمل مواد میں اِنسانی ذات کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ انسانی حافظہ کے کرشمے ہیں اگر کسی انسان کا حافظہ گم ہوجائے تو اسے نہ اپنی سابقہ زندگی کا کوئی واقعہ یاد رہتا ہے نہ کسی واقعہ کا تذکرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب حافظہ درست ہوجائے تو ماضی کے واقعات پھر اسی طرح اثر انداز ہونے شروع ہوجاتے ہیں، لیکن یہ خیال حقیقت کی جگہ سطح بینی کا نتیجہ ہے۔

بعض جگہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اِنسانی ذات صِرف اُس کا حافظہ ہوتی ہے، جو قدرے تفصیل سے وضاحت طلب ہے۔

The world is desperate for Prophet's (PBUH) revolutionary system

Episode No. 2

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

Again:

So far there has been little enough evidence of a generally felt sense of international unity embracing all mankind. It is too early yet to hope for this; but that particular groups of individuals in various countries have it in a very practical degree, is the guarantee that in due time the active experience of world co-operation may be more widely shared.[W. A. Gould, Man, Nature and Time, p. 284]

Gunnar Myrdal writes in Beyond the Welfare State:

Clearly, the complete realisation of our ideals would create a world without boundaries and without national discrimination, a world where all men are free to move around as they wish and to pursue on equal terms their own happiness. Politically, the implication would be a world state, democratically ruled by the will of all peoples. Somewhere in the religious compartment of our souls we all harbor thisvision of a world in perfect integration (p. 163).

Pitirim Sorokin is of the opinion that "as part of a vast ensemble of social and cultural changes necessary for the elimination of war, some sort of world government is indispensable."[Pitirim Sorokin, The Reconstruction of Humanity, p. 18]

Hugh Miller of the University of California writes:

Civilisation must recover the kinship of that association which originally established man on Earth, and which was then temporarily dispersed into clan and tribe and race…The next step in man's evolution must be a world society embracing mankind in which all the traditional cultures are woven into the great society of the future. [Hugh Miller. The Community of Man, pp. 131; 140]

Teilhard de Chardin – "a mystic, a theist, a Jesuit, a scientist, an evolutionary humanist and a prophet of world order" – says:

There is only one way which leads upwards; the one which through greater organisation, leads to greater synthesis and unity. The human consciousness must expand beyond the broadening, but still far too restricted, circles of family, country and race. The Age of Nations is past. The task before us now, if we would not perish, is to shake off ourancient prejudices, and to build the Earth. [Teilhard de Chardin, Building of the Earth, pp. 13; 16; 30]

Arnold Toynbee, the great historian, also visualises a world order "in which the whole of mankind will be able to live together in harmony, as members of a single all-

inclusive family." [Arnold Toynbee. A Study of History, Vol. XII. p. 279]
He elaborates this point in his small, yet very elucidating book, The Present Day Experiment in Western Civilisation, (1962), saying:
If we avoid committing mass-suicide, there is no reason why we should not eventually be able to have a world-state with a democratic parliamentary constitution. But if we are to avoid mass-suicide, we must have our world-state quickly, and this probably means that we must have it in a non-democratic constitutional form to begin with. Parliamentary government – and, a fortiori, democratic parliamentary government – is practicable only in a community whose members have a number of things in common – common political principles deriving from a common outlook that derives, in turn, from a common way of life. The different races, nations, civilisations, and religions of the present-day world are still far indeed from having even approached this degree of homogeneity and solidarity (p. 67).
And this is exactly what the Qur'an emphasized fourteen hundred years ago when it said:
Mankind is but one single community (2:213; 10:19).
The social order laid down by the Qur'an is the practical means to integrate mankind into one harmonious community. Such is the religion which Erich Fromm looks forward to appear within the next few hundred years,a religion which corresponds to the development of the human race; the most important feature of such a religion would be its universalistic character, corresponding to the unification of mankind which is taking place in this epoch; it would embrace the humanistic teachings common to all great religions of the East and the West...... It will be the first fully human religion in history. [Erich Fromm. The Sane Society, p. 352]
According to Wagar:
A rational, ethical, practical faith, in harmony with science and enabling man at last to live in harmony with himself and the cosmos. [Warren Wagar, The City of Man, p. 168]
Lewis Mumford says that humanity will suffer global destruction unless it adopts and practically implements the unity of humankind. The time for Western style societal gamesmanship is over because it has created hell on earth. The world needs an extraordinary virtuous leader who will break all the barriers that have chained and imprisoned humanity and have erected barriers in its path of development and progress; so that he can lead the caravan of humanity from the present desert of wilderness to towards the universal unity and the system of universal sustenance for all humankind.
If the true history of Islam was in front of these Western historians then they could see that that extraordinary virtuous leaderthey are searching for – who could take humanity out of the depth of societal darkness of subjugation to universal light of freedom, equality, and unity – came to this world in the form of Muhammad (PBUH)

and practically established the universal system they yearning for. And his supreme role model is inviting the world that if you want to take the world to unity then follow my shining footsteps.

Economic system

Today's period is called the age of economics. Communism and socialism claim universal equality of humankind. I have written so much about the weakness and shortcomings of these systems that there is no need to repeat it here.My topic for 1975 Tolu-e-Islam convention was “Where Marx failed” in which I explained that Marx himself admitted that, although the principle of communism is right, but it cannot be practically implemented because he said he cannot find the inner driving force behind the principle that: why one should work hard and give all the surplus wealth to the government to help others? So, I showed how our Prophet (PBUH) practically established this universal system of sustenance and how this system can be established even today in the light of the Quran. I want to mention one thing here: how our Prophet (PBUH) warned the custodians of capitalism that if you don't change this system then poor and subjugated will rise up against you and will sink the ship of capitalism taking down with everyone. The Prophet (PBUH) explained this with an example:

Some people boarded a ship. There were some people on the top deck and some at the bottom deck. Some people from the bottom deck went to the top deckto fetch water. The upper deck people denied the water saying you people from the bottom deck are bothering us. At this, the ones at the bottom deck told them that they will poke a hole in the ship and will get water that way.This way all them will sink. If the upper deck elite group had allowed them to take the water then everyone would be saved.

The Prophet (PBUH) issued this warning to the capitalists 1400 years ago. Do you see how this is true exactly today? Oxfam International reports the following facts:

“The world's richest 1% have more than twice as much wealth as 6.9 billion people. Almost half of humanity is living on less than $5.50 a day. Billionaires have now more wealth than the 4.6 billion people who make up 60 percent of the planet's population.Extreme inequality is out of control. Hundreds of millions of people are living in extreme poverty while huge rewards go to those at the very top. There are more billionaires than ever before, and their fortunes have grown to record levels. Meanwhile, the world's poorest got even poorer.Many governments are fueling this inequality crisis. They are massively under taxing corporations and wealthy individuals, yet underfunding vital public services like healthcare and education.These policies hit the poor hardest. The human costs are devastating, with women and girls suffering the most. Despite their huge contribution to our societies through unpaid care work, they are among those who benefit the least from today's economic system.”

Obviously, this kind of exploitative system of humanity cannot continue forever. This will lead to catastrophe. The Prophet (PBUH) warned about this 1400 years ago.

The only system that will survive is the one which is based on universal permanent values.

Religion

The custodians of religion blame the younger generation for the problems of the world because they say that the new generation is getting away from religion.Among these religious custodians are also our Muslim ones because Islam has become religion and is no longer the Deen that Allah gave, and our Prophet (PBUH) implemented it –and that continued until the first period of Islam. Professor Hocking draws the picture of what religion has become now:

"All living religionsare wretched vessels. They are all wrapped in sanctimony, dusty-eyed with self-satisfaction, stiff-jointed with the rheum-rust of their creedal conceits, so timorous under the whips of conformity thatonly a few dare the perilous task of thinking."

Bertrand Russell is clearer on the point when he says:

"Religion prevents our children from having a rational education; religion prevents us from removing the fundamental causes of war; religion prevents us from teaching the ethic of scientific co-operation in place of the old fierce doctrines of sin and punishment. It is possible that mankind is on the threshold of a golden age; but, if so, it will be necessary first to slay the dragon that guards the door, and this dragon is religion."

What kind of religion they are searching for is expressed by the famous American psychoanalyst Erich Fromm thus?

"A religion which corresponds to the development of the human race; the most important feature of such a religion would be its universalistic character, corresponding to the unification of mankind which is taking place in this epoch; it would embrace the humanistic teachings common to all great religions of the East and the West...... It will be the first fully human religion in history. [Erich Fromm. The Sane Society, p. 352]

Because the Western thinkers do not have any concept of Deen, therefore, they do not have in their language any word which could capture the concept of Deen. Whatever I have presented it is clear that Western thinkers are really searching for "Deen," not religion – as they are frustrated with religion. In fact, religion is entering an age in which it is ready forits own demise – because it has entered a phase in which it is doing its death dance. On the other side, even to Muslim mind the Deen has disappeared, so they practice Islam as a religion and present Islam to others as religion.

Debates and arguments

So, we engage in debates with other religionists to prove the superiority of Islam as a religion and then we celebrate our presumed victory over other religions. Leave aside common people, Mirza Ghulam Ahmad Qadyani declared himself a messenger from God in order to prove superiority of Islam over Christianity and Arya Samaj. To

defeat the Christians, he proclaimed that Jesus (PBUH) has died. He claimed this by saying that he is the one who broke the Jesus' crucifixion stand. On one hand he was claiming this, and other hand he was asking Muslims that it is their religious obligation to obey the British Colonial rulers because they believed in the crucifixion of Jesus (PBUH).He passed away beating the drum of his greatness and soon afterwards the followers of Jesus (PBUH) dismantled whatever was left of the Muslim nation after the first world war.In order to free Muslim from the bondage of sacred deception of religion, Allama Iqbal came up with the idea of a free Muslim nation Pakistan, so that superiority of Deen over all the other systems of life in the world could be proven by implementing the divine system of life of Deen in Pakistan.

Religiosity in Pakistan

But what a miserable tragedy that the greed of power byrulers, capitalists, and religious priesthood turned Allama Iqbal's dream into nightmare; and instead of resurrecting Deen, the religious priesthood entrenched itself even more forcefully and spread their religious deceptive web and its long tentaclesmuch more deeply and widely. The goal of religion is to gratify individual human emotion which it does by brainwashing people that they will get reward from God. Let me mention two recent examples that illustrate this. Imam of the Prophet's (PBUH) mosque in Medina came to Pakistan. When it was announced that he will lead the Juma'ah's prayer in the Badshahi Masjid then around five hundred thousand people came to attend the prayer. No doubt our love of the Prophet (PBUH) attracts us with anything that is attributed to his name. We don't even throw the seeds of dates so that human feet do not trample them. We burry them under the ground. The Imam of Prophet's (PBUH) mosque is Ahle-hadith and everyone knows about the extremism of House of Saud. What to say of building domes on mausoleums, they even level graves that protrude above the ground. They even leveled to the ground level the graves of the companions of the Prophet (PBUH). After theImam of Prophet's mosque, the Imam of Kaaba also came to Pakistan and delivered Jum'ah's sermon in the Badshahi masjid, and again, around five hundred thousand people attended the prayer. The Imam of Kaaba declared in his sermon that praying at a grave or making du'a at a grave is Kufr (Nawaa-e Waqt, Lahore, March 6, 1976). But after finishing the Jum'ah prayer and listening that praying at grave is Kufr by the Imam of Kaaba and gratifying their emotions, the crowd rushed to the Mausoleum of Data Ganj as preparations were being made for celebrating 'Urs. They not only prayed Fatiha at the Mausoleum but also sprayed rosewater and flowers and spread cloth sheet on the grave and gratified their emotions once again.And, in the night, they attended a dance show by famous Soviet dancers in Jinnah Garden, and gratified their emotions once again. The irony is that all the three events were organized by the government, which declares Islam as its religion.If, instead of religion if the state declared Islam as its Deen, then, in it there would have been no place of such eccentricities as these examples illustrate!

Islam has been reduced to just being sermon

I mentioned earlier that Deen has been reduced to just being sermon in religion. We have been listening forever that if Muslims get united then no nation on earth can dominate them. From pulpits of mosques and other platforms this sermonizing has reached international gatherings of Muslim leaders. Recently we had a conference in Lahore of leaders of all the Muslim countries who delivered speeches exhorting the unity of the Muslim Ummah and passed resolutions regarding this and then went back to their different countries. This has become a routine sacred ritual. Now currently there is Prophet's(PBUH) World Seerah Conference is going on in which more than hundred famous scholars from various Muslim countries are participating. They are proclaiming that 1400 hundred years ago the Prophet (PBUH) gave the idea of universal brotherhood of humankind; that if Muslim act on this ideology given by the Prophet (PBUH) then they will dominate the whole world (Nawaa-e Waqt, Lahore, March 6, 1976). Then collectively they prayed for the world domination of Islam.In fact, Maulana Kauthar Niyazee issued the following statement:

1976 is of special importance to Pakistan. In fact, this year is going to be the year of domination of Islam; it is going to be the year of the unity of Muslim Ummah. The forces of Baatil will get defeated this year, Insha Allah! (Nawaa-e Waqt, Lahore, March 6, 1976).

There must have been calls of Allahu Akbar for these great sermons delivered famous Muslim scholars of religion! But those whose heart's ears were tuned to hearing some inner voice emanating from Allama Iqbal's grave from the other side of the mosque must have listened to his call as well:

Keep them busy in hallowed rituals
Make them strong in ascetic mindset

Warning of Toynbee

So, therefore, it is clear those addicted to religious cannabis are used to daydreamingthese beautiful dreams. But deep thinkers who have the realities in front of them, what do they say about us? Arnold Toynbee is the great historian of our time. He says (in his book, The World and the West) that there are many ideologies in the West that are very harmful for progress and development for humanity. Among them is our nationalism. But Turks and other Muslim nations are adopting nationalism just as they are adopting other ideologies of the West. TO BE CONTINUED

MATRIMONIAL

We are seeking for our son, A UK Born (Pakistani origin) Quran Loving boy aged 26, a match for marriage with a Quran Loving girl from anywhere around the world (preferablly from Pakistan). She must have a good command of English, aged 22-25 years old. His CV will be provide upon request.

Please contact by whats app/mobile/ viber + 44 782 486 1228
Email: quranonly12@gmail.com

پمفلٹس
PAMPHLETS
ادارہ طلوعِ اسلام کے زیر اہتمام
شائع ہونے والے پمفلٹس
فی پمفلٹ قیمت: 20 روپے

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
10

Monthly **TOLU-E-ISLAM**

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں